سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) — ۱۵۲

گارساں دتاسی

کے

تمہیدی خُطبے

2488

جو ہندوستانی زبان کے درس کے آغاز پر ہر سال دیے جاتے تھے

(۱۸۵۰ — ۱۸۵۵ء)

بہ تصحیح عبد السّتّار صدّیقی

انجمن ترقیِ اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۴۰ء

ANJUMAN TARAQQI URDU HIND
REVISED

تمہیدی خطبے

جو ہندوستانی کے درس کے آغاز میں دیے گئے

پہلا خطبہ

۳ دسمبر ۱۸۵۰ء

صاحبو! قبل اس کے کہ میں نصاب کی اِس کتاب پر جو ہمارے سامنے ہی کچھ بیان کروں، میں ہندوستانی زبان کے علمی فائدے اور اِس وقت ادبی حیثیت سے اُس کی اہمیت کے متعلق چند لفظ کہنا چاہتا ہوں۔

عام طور پر لوگ پوری طرح یہ نہیں جانتے کہ ہندوستانی ہندوستان کے تمام صوبوں میں بولی جاتی ہی۔ بعض جگہ اُس کے ساتھ صوبے کی دوسری بولیاں بھی شریک ہیں؛ جیسے بنگال میں اور اِحاطۂ مدراس اور اِحاطۂ بمبئی میں۔ اور بعض مقامات پر تنہا وہی بولی جاتی ہی جیسے ہندوستان کے صوبۂ ممالک مغربی و شمالی، بہار، الٰہ آباد، مالوے، اودھ، اجمیر، آگرے، دہلی میں ہا اور اِن مقامات کے ساتھ لاہور اور نیپال کے نام بھی شریک کرنے چاہییں۔ پیرس میں رہ کر مجھے جو معلومات حاصل ہوسکیں اُن کی بنا پر میں نے یہ رائے قائم کی ہی:۔

اگر کوئی شخص اِن صوبوں میں بود و باش کرنا یا سیاحت کرنا چاہے جو وہ نہایت آسانی کے ساتھ بغیر کسی پروانۂ راہ داری کے کرسکتا ہی، تو اُس کے لیے ہندوستانی زبان کا جاننا ضروری ہی۔ یہی وجہ ہی کہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی ملازمت میں

(ملکی ہو یا فوجی) صرف اُنھیں اشخاص کو داخل کرتی ہی جو ہندوستانی زبان جانتے ہیں یا جو ہندوستانی زبان کے اِمتحان میں شریک ہوکر کامیاب ہو چکے ہیں۔

لیکن یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں صرف انگریز ہی کاروبار کرسکتے ہیں۔ بہت سے دوسرے یوروپین بھی وہاں معزز خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور اگر کوئی ہندوستانی جانتا ہو تو وہ آسانی سے آزادی کے ساتھ روزی کما سکتا ہی۔ قطع نظر تجارت کے جو اکثر یورپینوں کا ذریعۂ تمول ہی، اگر کوئی چاہے تو طبابت کرسکتا ہی، مصوّری کا پیشہ اِختیار کرسکتا ہی، یا اگر اُسے ہندوؤں، مسلمانوں اور انگریزوں کے قانون کا علم ہی اور ساتھ ہی ہندوستانی پر عبور ہی تو وہ وکالت کرسکتا ہی۔

مُبلّغین مسیحیت بیگم شمرو کے خوب صورت گرجا میں، جو سردھنے میں ہی، یا آگرے کے کیتھلک چرچ یا دوسرے مقامات میں اُردو میں وعظ و تلقین کرتے ہیں۔ خود کلکتے میں ایک گرجا ہی جسے ہندوستانی گرجا کہتے ہیں اور جو اُن ہندوستانیوں کے لیے تعمیر کیا گیا ہی جو انگلی کن کلیسا کے توسط سے عیسائی ہوئے ہیں۔ وہاں عبادت ہندوستانی زبان میں ہوتی ہی۔ عام طور پر اِس کا علم نہیں ہی کہ ہندوستان کے بڑے شہروں میں لیتھو کے مطبع کا رواج ہی، جہاں روزانہ ہندوستانی زبان کی کتابیں چھپتی ہیں، ان میں ترجمے بھی ہوتے ہیں اور تصنیفات بھی۔ میں صرف ممالک مغربی شمالی کا ذکر کرتا ہوں جس کا نام میں نے ابھی لیا تھا۔ یہاں اِس سال کی پہلی جنوری کو ۲۳ مطبعے تھے جن میں صرف گزشتہ سال (۱۸۴۹ع) ۱۴۱ مختلف قسم کی کتابیں طبع ہوئی تھیں۔ علاوہ اِن کے ۲۶ اخبار اور رسالے بھی اِنھیں مطبعوں میں چھپتے تھے جن میں سے ۲۳ ہندوستانی زبان کے تھے، دو فارسی کے اور ایک بنگالی کا۔ اب اگر اِن میں وہ اخبار اور رسالے بھی شامل کر لیے جائیں جو

ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں شائع ہوتے ہیں تو ہندوستانی اخبارات کی کل تعداد جو اِس وقت موجود ہے آسانی سے پچاس تک پہنچ جائے گی۔

ہندوستانی زبان بلاشبہہ ترقی پذیر ہے۔ اِس سے میرا یہ مطلب ہے کہ بجائے لوگوں کی معمولی اور روزمرہ کی زبان کے یا عوام پسند گیتوں کی زبان کے وہ گورنمنٹ کی دفتری زبان ہوگئی ہے جیسے پہلے فارسی تھی۔ یعنی اب وہ سیاسی مراسلت، عدالتوں اور انتظامی محکموں کی زبان ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستانی میں اب سائنس پر رسالے اور کتابیں لکھی جانے لگی ہیں جو اب تک صرف فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔

اُردو کی موجودہ ادبیات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مشرقی ممالک کی دوسری زبانوں کے ادب کی طرح اُردو ادب بھی ہمارے لیے باعث دلچسپی ہے۔ اگر کسی صاحب کو اُردو ادب کا شوق ہو تو وہ شملے کا اُردو اخبار اپنے نام جاری کرا سکتے ہیں جو اُنھیں پابندی کے ساتھ ڈاک کے ذریعے پیرس پہنچتا رہے گا۔ دہلی کی مجلس ادبی اُردو زبان کے مختلف مطبوعات پر ماہانہ رسالے کی شکل میں تنقیدیں شائع کرتی ہے۔ یہ تنقیدیں بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اِن سے ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے قدیم دارالسلطنت میں اُردو کی کون کون سی کتابیں طبع ہوئیں۔

ہندوستانی زبان کی اُن کتابوں میں سے، جو حال میں شائع ہوئی ہیں، اکثر سائنس، جغرافیہ، قانون، اور دوسرے فنون پر ہیں؛ کچھ تو جدید تصنیفات ہیں اور کچھ انگریزی کے ترجمے ہیں۔ کچھ دینی اور مذہبی مختلف فیہ مسائل کی کتابیں بھی ہیں جن میں ہم کیتھلک مذہب کی بھی بعض کتابیں شامل کرتے ہیں جو آگرے میں چھپی ہیں۔ اِن میں قدیم اور جدید زمانے کی چند تاریخیں اور اخلاقی اور مذہبی کتابوں کے ترجمے بھی ہیں۔ مثلاً بن یَن کی "پِل گرِمس پروگرِس" اور میسن کی "سیلف نالج"، کے ترجمے۔ قصے کہانیوں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں؛ مثلاً "رِسیلے لاس"

اور ”قزلباش“۔ بعض نظموں کے ترجمے بھی کیے گئے ہیں؛ مثلاً گے کی حکایتوں کا ترجمہ ۔

یہ امر پوشیدہ نہیں کہ سنسکرت سے بھی بہت سے ترجمے ہندوستانی میں ہوئے ہیں۔ لیکن یہ حال میں طبع اور شائع نہیں ہوئے ۔ مگر عربی فارسی سے بہت سے ترجمے شائع ہو رہے ہیں۔ اِن میں قرآن شریف کے کئی ترجمے ہیں جو تفسیر کے ساتھ چھپے ہیں، ایک عربی لغات بھی ہو جس میں الفاظ کے معنی ہندوستانی میں دیے ہیں۔ کئی عربی فارسی کی صرف و نحو کی کتابیں، ”گلستان“ کے متعدد ترجمے، ”الف لیلہ“ کے دو ترجمے، ”اخلاقِ جلالی“ ”اخلاقِ محسنی“ کے ترجمے ”شاہ نامے“ کا ایک خلاصہ، ابن خلکان، تاریخ ابو الفدا اور ”قصیدہ بردہ“ کے ترجمے ہیں ۔

اصل تصانیف میں میں صرف چند دلکش نظموں کا نام لوں گا۔ یعنی ”شکنتلا“ ”لیلیٰ مجنوں“، ”ابراہیم ادھم“ اور ”حسن و عشق“ کے مشہور قصے منظوم کیے گئے ہیں ۔ علاوہ اِن کے چند سیاحت نامے اور چند تاریخیں بھی شائع ہوئی ہیں جن میں سے ایک ٹیپو سلطان کے باپ حیدر علی کی تاریخ ہو جو شاہ میسور کے ایک بیٹے نے لکھی ہو ۔ نثر میں بہت سے ناول اور قصے کہانیاں، لُغت پر بعض مفید کتابیں اور ایک انگریزی کی صرف و نحو پر بھی لکھی گئی ہو ۔ آخر میں میں حال کے زندہ ہر دل عزیز شعرا یعنی مومن، نصیر، ذوق، ناسخ اور آتش کے کلام کا ذکر کرتا ہوں ۔ یہ شاعر اِس وقت زمانۂ حال کی ہندوستانی زبان پر بہت بڑا اثر رکھتے ہیں ۔

دوسرا خطبہ

۴ دسمبر ۱۸۵۱ع

صاحبو! مجھے دلی مسرّت ہی کہ اِس تعلیمی سال کے اِفتتاح پر میں اپنے لکچروں میں اپنے نئے اور پرانے شاگردوں کو دیکھتا ہوں - آپ نے ہندوستانی زبان کے مطالعے کا جو شوق کیا ہی وہ میری راے میں بہت مستحسن ہی - یہ دنیا کی نہایت وسیع الاشاعت زبانوں میں سے ہی، کیوں کہ آٹھ کروڑ سے زیادہ اشخاص اسے بولتے ہیں اور سیاسی اور تجارتی لحاظ سے خاص طور پر قابل لحاظ اور لائق وقعت ہی - اور سب سے بڑی بات یہ ہی کہ اِسے حقیقی ادبی حیثیت حاصل ہی اور اِسی نقطۂ نظر سے برِّ اعظم یورپ میں اِس کا مطالعہ مفید ہوگا - اِس زبان کی ہندو شاخ سنسکرت کی ایک سادہ اور سلیس صورت ہی اور اُس کا ہندوستانی زبان سے تقریباً وہی تعلق ہی جو جدید یونانی زبان کا قدیم یونانی زبان سے اور اِطالوی کا لاطینی سے ہی - لہٰذا اِس کا علم ہندوستان کی زبانوں کے محقق کے لیے نہایت کارآمد ہی - وہ جدید صورتوں میں کہیں تو قدیم شکلوں کا اِختصار اور کہیں اُن کی توسیع دیکھے گا - اِس کی اسلامی شاخ اُن لوگوں کے لیے بہت مفید ہی جو فارسی زبان کا مطالعہ کررہے ہیں -

فارسی اور ہندوستانی کی اصل ایک ہی ہی، لیکن ہندوستانی کی ساخت اور طرز ادا زیادہ سلیس اور سادہ ہی - اگر فارسی کے طویل جملے ہندوستانی کی ساخت کے مطابق ادا کیے جائیں تو مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہی - آپ صاحب، جو اِن شیریں اور دل پذیر زبانوں کا مطالعہ کررہے ہیں، میرے اِس بیان کی

تصدیق خود کرلیں گے ۔ اِن میں سے ایک سنسکرت ہے جو ہماری تمام یورپی زبانوں کی اصل ہے اور اُس کا تعلق اب تو سامی زبانوں سے بھی بیان کیا جاتا ہے کیوں کہ خیال یہ ہے کہ عربی کا سہ حرفی مادّہ مصنوعی ہے اور ان میں کے بہت سے مادے ایک بول کے ہیں ۔ اِس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ بھی سنسکرت کے اصول پر بنے ہیں اور بہت سے سنسکرت اور عربی کے مادّوں کی اصل مشترک ہے[1]۔ دوسرے فارسی زبان ہے جو تاریخی تصانیف سے مالا مال ہے اور اُس کا ادب خاص امتیاز اور خصوصیت رکھتا ہے، جس میں اسلامی تصوّف نے نئی جان ڈال دی ہے۔

ہندوستانی زبان کی ہندوی اور اسلامی شاخوں کا ادب صرف کثیر ہی نہیں بلکہ مختلف نوعیت کا بھی ہے ۔ ہندی میں سنسکرت کی اعلیٰ تصانیف کے ترجمے موجود ہیں یا کم سے کم اُن کا تتبع کیا گیا ہے اور اُردو اور دکھنی میں ہم فارسی کی اعلیٰ تصانیف کے ترجمے یا اُن کے نمونے دیکھتے ہیں ۔

اِس سال کے دوران میں میں آپ سے اِن مختلف زبانوں کی بعض ادبی تالیفات کا ذکر کروں گا ۔ سنسکرت کے فریق سے (جن کی زبان ہندوستانی ہے) ہمیں "شکنتلا" کا دلچسپ قصّہ ملے گا جو یورپ میں بہت مشہور اور ہر دل عزیز ہے ۔ علاوہ اُس کے ہم "اُشا" ۔ ۔ ۔ ۔ کا قصہ بھی پڑھیں گے جو اگرچہ اِس قدر معروف نہیں مگر بہت دل کش ہے ۔

فارسی کا فریق (جن کی زبان اسلامی ہندوستانی ہے) ولی کا دیوان پیش کرے گا ۔ "ولی" ہندوستان کا "حافظ" ہے ۔ اگرچہ اُس کی غزلوں میں کسی قدر تکلف پایا جاتا ہے لیکن ان میں حقیقی خوبیاں بھی موجود ہیں ۔ اور اُس کی غزلیں خوبی میں کسی طرح فارسی غزلوں سے کم نہیں ۔ نثر میں ہم شیر شاہ کی تاریخ کا ایک حصّہ پڑھیں گے، جس میں

---

[1] [یہ خیال اب مدت کا غلط مانا جاچکا ہے ۔ سامی زبانوں کو سنسکرت سے اصلاً تعلق نہیں ۔ ع ص ۔]

ہم علاوہ دُوسری باتوں کے ہندوستان کی اسلامی حکومت کے اِنتظامات کے متعلق عجیب واقعات دیکھیں گے۔

اب رہا خالص ہندوستانی فریق، مَیں اِس سے ایک کتاب "مہر و ماہ" لے کر آپ کو سناؤں گا۔ یہ ایک افسانہ ہی جس میں آپ مختلف نسلوں کے متعلق مفید اور پُراز معلومات تفصیل پائیں گے جو جدید اور انوکھے اِستعاروں سے اور بھی پُرلطف ہوگئی ہی۔

آخر میں مَیں آپ کو کلجگ کا شاعرانہ بیان سناؤں گا۔ کلجگ وہی ہی جسے یونانی دیومالا میں لوہ جگ کہتے ہیں۔ یہ نظم ہُو بہُو انگریزی شاعر ڈرای ڈن کی نظم سے ملتی ہی۔ اُس نے بھی اِسی مضمون پر طبع آزمائی کی ہی[1]۔

اِن میں سے اکثر تالیفات نظم میں ہیں۔ لیکن آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ چوں کہ یہ کتابیں نظم میں ہیں اِس لیے نثر سے مشکل ہوں گی۔ یہ بات نہیں ہی۔ اگرچہ نظم میں زبان کی ساخت اور ترکیب کے معمولی قواعد کی پابندی نہیں کی جاتی اور اور بعض اوقات ایسی ترکیبیں آجاتی ہیں جو مصنوعی اور خلاف روزمرہ معلوم ہوتی ہیں یا نثر کے مقابلے میں اُس کی تشبیہات و استعارات زیادہ مبالغہ آمیز ہوتے ہیں، تاہم نظم میں ایک بڑا فائدہ یہ ہی کہ اُس میں صاف طور سے یہ معلوم ہوجاتا ہی کہ مطلب یہاں ختم ہوتا ہی کیوں کہ نظم میں مطلب گڈمڈ نہیں ہونے پاتا اور ایک جگہ سے پھاند کر دوسری جگہ نہیں پہنچ جاتا۔ اکثر تو یہ ہوتا ہی کہ مطلب ایک ہی شعر میں ختم ہوجاتا ہی اور کسی حالت میں ایسا نہیں ہوتا کہ دو یا تین شعروں سے

---

[1] انسان اخلاقی بندھنوں سے چھوٹ کر آزاد ہوگیا ہی۔ مہمان نوازی کے حقوق اب مطلق باقی نہیں رہے۔ مہمان میزبان کے ہاتھوں سے قتل ہوتا ہی۔ داماد خسر کی جان کے درپے ہی۔ بیوی خاوند کی قاتل ہی اور خاوند بیوی کی جان کا لاگو ہی۔

آگے نکل جائے۔

جس طرح ہندوستانی کے لکھنے کے دو طریقے ہیں، ایک فارسی حروف میں اسلامی ہندوستانی کے لیے اور دوسرا دیوناگری میں ہندوی ہندوستانی کے لیے اسی طرح عروض بھی دو ہیں، یعنی شعر کی تقطیع کے بھی دو طریقے ہیں۔ ہندوستانی کی اُردو اور دکھنی شاخ کے لیے عربی عروض استعمال کیا جاتا ہی (البتہ زبانوں کے فرق کی وجہ سے اس میں مناسب تغیر و تبدل کرلیا گیا ہی) اور ہندی کے لیے سنسکرت عروض کا ایک سادہ طریقہ مستعمل ہی۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہی، عرب شعر کو خیمے کے مثل سمجھتے تھے اور یہی وجہ ہی کہ اُس کا نام عربی میں "بیت" ہی جس کے معنی خیمے کے ہیں اور بعدازاں گھر کے ہوگئے۔ خیمے میں دو دروازے ہوتے ہیں۔ ان دروازوں کو "مصرع" کہتے ہیں اور یہی وجہ ہی کہ شعر کے دو ٹکڑے "مصرع" کہلاتے ہیں۔ خیمہ تھموں (ارکان) پر کھڑا ہوتا ہی۔ شعر کے مختلف اوزان ہوتے ہیں، جن میں دس اصل ہیں اور بہتر فروع۔ خیمے کا اندرونی حصّہ اوٹ (فاصلہ) سے الگ الگ کرلیا جاتا ہی اور خیمہ میخوں (وتد) اور رسّیوں (سبب) سے باندھا جاتا ہی۔ یہ وہ نام ہیں جو بحرِ طویل اور بحرِ قصیر کی چھ تقسیموں کو دیے جاتے ہیں۔

اصول اور فروع کے ملنے سے بے شمار بحریں پیدا ہوگئی ہیں۔ لیکن اُردو اور دکھنی میں صرف بیس استعمال کی جاتی ہیں۔ اشعار ہمیشہ مقفّیٰ ہوتے ہیں۔ اگر قافیہ ہر مصرع میں پایا جائے تو قافیہ ہر بیت میں بدل جاتا ہی اور اگر قافیہ صرف آخر میں آئے تو ساری نظم میں وہی رہے گا۔

ہندو طریقہ زیادہ سادہ ہی۔ اِس میں صرف بول (Syllable) کا خیال رکھا جاتا ہی خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، جیسا انگریزی میں ہی۔ اور بعض اوقات جیسا انگریزی

میں ہوتا ہی، ضرورت شعری کے لیے بولوں کو مختصر کر کے ایک کر دیتے ہیں یا کبھی اِس کے برعکس کرنا پڑتا ہی۔ اِسے "ماترا" کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھی اِس کا یہی نام ہی۔

ہندی اور اُردو دونوں شاخوں میں نظم مقفّیٰ ہوتی ہی اور اکثر دونوں مصرعوں میں قافیہ پایا جاتا ہی۔ ہندی میں چوپائی کا بہت رواج ہی جو سنسکرت کے اشلوک سے بہت ملتی جلتی ہی اور اِس کے ہر مصرع میں آٹھ بول ہوتے ہیں۔ "دُہرا" فرد کے مقابل میں ہی۔ "فرد" عرب کا "بیت" ہی جو اوروں سے الگ تھلگ ہی۔ اِس کے ہر مصرع میں بارہ سے چودہ بول تک ہوتے ہیں۔

صاحبو! میں مطالعے کے دوران میں اِس کا خیال رکھوں گا کہ آپ کو اوزان بتاتا جاؤں اور جن اُصول کا بیان آپ کے سامنے کیا گیا ہی اُن کے مطابق تقطیع کرتا جاؤں۔

جس زبان کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ واقعی طور پر زندہ زبان ہی، کیوں کہ جس وقت ہم پیرس میں وہ کتابیں پڑھ رہے ہوں گے جن کا نام میں نے لیا ہی، اُس وقت ہندوستان میں سینکڑوں مطبوعات شائع ہو رہے ہوں گے۔ یورپ میں بیٹھ کر انسان ہندی اور ہندوستانی کتابوں، پمفلٹوں، اور وقتی رسالوں اور اخباروں کی تعداد کا جو ہندوستان میں شائع ہوتے ہیں، صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔

پچھلے سال مَیں نے آپ سے بیان کیا تھا کہ ممالک مغربی و شمالی میں، جسے سرکار انگریزی ایک بڑا صوبہ بنانے والی ہی اور جس کا دارالحکومت لاہور ہوگا اور جہاں کی زبان صرف ہندوستانی ہی، جنوری ۱۸۵۰ع میں ۲۳ سنگی مطبعے تھے جن میں ہندوستانی کتابیں چھپتی تھیں۔ پچھلے ہی سال لاہور میں ایک اور مطبع قائم ہوا۔ گویا اِس سال یکم جنوری کو مطبعوں کی تعداد چوبیس

ہوگئی - یعنی سات آگرے میں، پانچ دہلی میں، دو میرٹھ میں، دو لاہور میں، چار بنارس میں، ایک بریلی میں، ایک کان پور میں، ایک شملے میں اور ایک اندور میں - لیکن ہندوستان کا یہی ایک حصہ ایسا نہیں ہو جہاں ہندوستانی کتابیں اور اخبار چھپتے اور شائع ہوتے ہیں - اِس قسم کے مطبعے تین اِحاطوں کے دارالحکومتوں میں، نیز بہت سے دوسرے شہروں میں بھی پائے جاتے ہیں - صرف ایک لکھنؤ ہی میں تیرہ ہیں جو مصروف بکار ہیں -

چند ہی روز ہوئے میرے پاس ہندوستانی کتابوں کی ایک مفصل فہرست پہنچی ہو - اِس میں بہت سی کتابیں ہیں اور ہر قسم کی ہیں - کچھ جدید تصنیفات ہیں اور کچھ ترجمے - یہ سب کتابیں ۱۸۵۰ع میں ممالک مغربی و شمالی میں شائع ہوئی ہیں -

صاحبو! میں اِن میں سے چند کتابوں کے نام پیش کرتا ہوں اور مجھے امید ہو کہ آپ اِن کا ذکر ادبی یا فلسفیانہ دلچسپی کی وجہ سے شوق سے سُنیں گے - علاوہ دوسری کتابوں کے قرآن شریف کے متعدد اڈیشن عربی اور اُردو میں شائع ہوئے ہیں، ایک نعت جس میں مُحمّدؐ رَسُولُ اللہ (صلعم) کے معجزات کا ذکر ہو، رد فرقۂ وہابی ہندی میں، کئی رسالے جین مت پر، نظیر اکبرآبادی کی نظموں کا مجموعہ جن کا حال ہی میں اِنتقال ہوا اور ہندوستان میں بہ حیثیت شاعر کے اِن کی بڑی شہرت اور عزت تھی، مشہور صوفی علی حزیں کی سوانح عمری، جو علاوہ اور باتوں کے بعض بہت دلچسپ کتابوں کے مصنّف بھی تھے جن کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہو، تاریخ پنجاب مصنفۂ دیبی پرشاد ساکن بنارس، تاریخ خاندان سندھیا مصنفۂ دھرم نارائن ساکن اندور، ایک قصہ نظم میں جس کا نام

دلخت جگر، ہی بال مکند سکندر آباد کے رہنے والے نے لکھا ہی- اگرچہ یہ شخص ہندو ہی جیسا کہ اِس کے نام سے ظاہر ہی مگر اس نے یہ تصنیف اُردو میں کی ہی اور آپ کو معلوم ہی کہ اُردو شمال میں "مسلمانوں کی ہندوستانی" ہی-

ہندوستانی ادب کے شعبوں میں سب سے مقدّم شاعری ہی اور اُسے بڑی کامیابی اور ذوق و شوق کے ساتھ ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہی- اور اس مقدس آگ کو خاص ادبی جلسوں کے ذریعے سے، جن کا نام مشاعرہ ہی، زندہ رکھا جاتا ہی- ہندوستانیوں میں اِس قسم کے ادبی جلسوں کا خاص ذوق ہی- یہاں تک کہ اور لوگ بھی (شاعری جن کا پیشہ یا فن نہیں ہی) شوقیہ طور پر معیّنہ ایّام میں عموماً پندرہ روز میں ایک بار اپنے گھروں پر شام کے وقت ایسے جلسے کرتے ہیں- جس شخص کے مکان پر یہ جلسہ ہوتا ہی وہی میر مشاعرہ بھی ہوتا ہی- وہ شہر کے اُن تمام اصحاب کو، جو شعر سے شوق رکھتے ہیں، دعوت دیتا ہی اور اُن سے درخواست کرتا ہی کہ اِس موقع کے لیے فلاں بحر میں (مصرع طرح پر) شعر کہنے کی زحمت فرمائیں -

اِس وقت کے نہایت مشہور زندہ شاعروں میں دو بادشاہ بھی ہیں - ایک شہنشاہِ دہلی دوسرے بادشاہِ اودھ - کچھ زمانہ قبل ہندوستان کے مسلمان بادشاہ اور فرماں روا فارسی بولتے تھے اور فارسی ہی لکھتے تھے اور معمولی (بول چال کی) زبان کو حقیر سمجھتے تھے لیکن آج وہ اپنی رعایا کی تقلید میں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے، خواہ تحریریں ہوں یا تقریریں ، ہندوستانی زبان استعمال کرتے ہیں-

صاحبو ! اِن دو بادشاہ شاعروں میں سے پہلے بہادر شاہ ثانی ہیں جو شاہ عالم کے پوتے ہیں اور جن کا ہندوستانی شعرا میں شمار ہوتا ہی - بادشاہ کے بیٹے شاہزادۂ دارا بھی بہت اچھے شاعر ہیں - بادشاہ کا تخلّص "ظفر" ہی اور جب

اُن کا ذکر شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہی تو اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ دوسرے واجد علی شاہ ہیں۔ اِن کا تخلّص 'اختر' ہی۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں، موسیقی میں بھی ماہر ہیں۔ جو غزلیں وہ لکھتے ہیں اُن کے راگ راگنیاں بھی وہ خود ہی تجویز کرتے ہیں۔ اِن دونوں بادشاہ شاعروں کا کلام ہندوستان میں بہت مقبول ہی۔ اور جو کلام مَیں نے اُن کا پڑھا ہی، اگر انصاف سے دیکھا جائے تو وہ اِس کے مستحق ہیں۔ اُن کے حق میں بلا کسی مبالغے کے عربی کی یہ مثل بالکل صادق آتی ہی: "کلام الملوک ملوک الکلام"۔

تیسرا خطبہ

۵ دسمبر ۱۸۵۲ء

صاحبو! لفظ "ہندوستانی" اُس زبان کے حق میں جس کے لیے یہ استعمال کیا جاتا ہے ناموزوں ہے اور اُسے اِس نام سے یاد کرنا ہماری بد مذاقی ہے[1]۔ ہم [فرانسیسی] اُس کو ہندوستانین (Hindoustanien) کہہ سکتے ہیں، مگر انگریزوں کی تقلید میں ہم نے بھی اُس کی ابتدائی شکل قائم رکھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ ہندوستانی، اہل ہندوستان کی زبان ہے مگر یہ زبان اپنے حقیقی حدود سے باہر بھی بولی جاتی ہے خصوصاً مسلمان اور سپاہی اِس کو تمام جزیرہ نمائے ہند نیز ایران، تبت اور آسام میں بولتے ہیں۔ پس اِس زبان کے لیے لفظ "ہندی" یا "اِنڈین"، جو اِبتدا میں اِس کو دیا گیا تھا اور جس نام سے کہ اکثر باشندے اِس ملک کے اب تک اِس کو موسوم کرتے ہیں، اُس نام سے زیادہ موزوں ہے جو اہلِ یورپ نے اختیار کیا ہے۔ اہلِ یورپ لفظ ہندی سے ہندوؤں کی بولی مراد لیتے ہیں جس کے لیے "ہندوئی" بہتر ہے اور مسلمانوں کی بولی کے واسطے "ہندوستانی" کا نام قرار دے لیا ہے۔ خیر یہ جو کچھ بھی ہوا، ہندوستان کی اِس جدید زبان کی دو بڑی اور خاص شاخیں برٹش اِنڈیا کے بڑے حصّے میں بولی جاتی ہیں اور شمال کے مسلمانوں کی زبان یعنی ہندوستانی اُردو ممالک مغربی و شمالی کی سرکاری

---

[1] [مطلب یہ ہے کہ فرانسیسی زبان کے لحاظ سے نسبت کی علامت ین ہونا چاہیے فارسی کی نسبتی ی فرانسیسی میں بے معنی ہے۔ ع۔ ص۔]

زبان قرار دی گئی ہے - اگرچہ ہندی بھی اُردو کے ساتھ ساتھ اُسی طرح قائم ہے جیسے کہ وہ فارسی کے ساتھ تھی - واقعہ یہ ہے کہ مسلمان بادشاہ ہمیشہ ایک ہندی سکرٹری، جو ہندی نویس کہلاتا تھا، اور ایک فارسی سکرٹری، جس کو وہ فارسی نویس کہتے تھے، رکھا کرتے تھے تاکہ اُن کے احکام اِن دونوں زبانوں میں لکھے جائیں - اِسی طرح برٹش گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی میں ہندو آبادی کے مفاد کے لیے اکثر اوقات سرکاری قوانین کا اُردو کتابوں کے ساتھ ہندی ترجمہ بھی دیوناگری حروف میں دیتی ہے -

صاحبو! میں نے اِس سے قبل آپ کے سامنے کئی مرتبہ ہندوستانی علم و ادب اور اُس کی مختلف شاخوں کے متعلق تقریر کی ہے - آپ کو معلوم ہے کہ اِس زبان کی تاریخ کی پہلی جلد میں میں نے ۷۵۰ مصنفوں اور آٹھ سو سے زیادہ کتابوں کا ذکر کیا ہے - اُس کی تیسری جلد میں، جس کے طبع ہونے میں بعض وجوہ سے تاخیر ہو گئی ہے، میں اِس سے دو چند جدید مصنّفوں کا اور اِسی قدر کتابوں کا احوال لکھوں گا - دیسی سوانح نویس عموماً صرف اُن لوگوں کے چند اشعار لکھ دینے پر اکتفا کرتے ہیں جن کی سوانح عمری وہ لکھ رہے ہیں اور اُن کی خاص خاص تصانیف اور تالیفات کا ذکر نہیں کرتے -

اِس وقت میں اُن بے شمار مصنفین میں سے صرف تین کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، جن کے متعلق میں نے اِطلاع بہم پہنچائی ہے - یہ تینوں صاحب دہلی کالج کے پروفیسر ہیں جہاں کا صدر یعنی پرنسپل بارہ سال سے ایک مشہور فرانسیسی فیلیکس بوترو (Felix Boutros) ہے - صدر مذکور "ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی" (یعنی انجمن ترجمہ) کے بانیوں میں سے ہیں - اور اِس انجمن نے سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں سے ترجمے کر کے ہندوستانی زبان کی بڑی خدمت کی ہے -

اِن میں سے پہلے شخص رام چندر ہیں جن کے عیسائی مذہب قبول کر لینے پر (اور کہا جاتا ہی کہ دہلی کے یہ پہلے ہندو ہیں جنھوں نے یہ مذہب اختیار کیا) اِس سال جولائی میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی - اِس پنڈت کی عمر اِس وقت ۳۵ سال کی ہی - یہ شخص دہلی کالج کا طالب علم تھا - اور اِس کالج میں اِس نے انگریزی، ہندوستانی اور فارسی زبانوں کو حاصل کیا تھا - لیکن علم ریاضی کی طرف اُس کا خاص رُجحان تھا - وہ متعدد مفید کتابوں کا مصنّف اور مترجم ہی جن میں سے ایک الجبرا ہی جو (Bridge and Cube) کی تقلید میں لکھا گیا ہی - ایک کتاب علمِ مثلّث پر ہی جس میں مخروطات بھی شامل ہیں (Analytical Trignometry with Conic Sections) اور ایک کتاب علم ہندسہ پر ہی جو (Huttan & Bouchorlat) کے طریقے پر مرتّب کی گئی ہی - ایک کتاب علم حساب پر لکھی ہی اور اِن کے علاوہ کئی کتابیں ادب پر ہیں - یہ پروفیسر دو رسالوں کے اڈیٹر بھی ہیں - ان میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہی جس کا نام "محبوب ہند" ہی - یہ ایک ماہانہ پرچہ ہی جس میں اہم مسائل و معاملات وقت پر، اہلِ ہند کی تعلیمی حالت پر اور عام ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں -

دوسرے صاحب جن کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں رام کرشن ہیں - نہایت ذہین اور انگریزی ادب میں ویسے ہی قابل ہیں جیسے رام چندر - یہ کشمیری النسل اور دہلی کے رہنے والے ہیں - اِن کی عمر قریب چالیس سال ہی - اِنھوں نے بہت سے مضامین انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیے ہیں جن کی عبارت نہایت فصیح اور شستہ ہی - چند اُن میں سے یہ ہیں - دی پرنسپلس آف ہندو لا (اصول ہندو شاستر) مصنّفہ سر ولیم میکناٹن کا ترجمہ - یہی وہ صاحب ہیں جو عربی الف لیلہ

کے اڈیٹر ہیں اور افغانوں اور انگریزوں کی گزشتہ لڑائی میں بہ مقام کابل مقتول ہوئے - ترجمہ "اصول حکومت" (دی پرنسپلس آف گورنمنٹ) کے علاوہ بھی قانون پر ان کی کئی تالیفیں ہیں - نیز دوسرے فنون میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں مثلاً فن زراعت پر، طب پر اور ایک انگریزی گرامر ہندوستانی زبان میں جس کے لکھنے میں انھیں ڈاکٹر اشپرنگر (Sprenger) نے بھی مدد دی ہی - ڈاکٹر اشپرنگر اُس وقت دہلی کالج کے پرنسپل تھے، آج کل فورٹ ولیم کالج میں ممتحن اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سکرٹری ہیں - اِن میں سے تیسرے صاحب کریم الدین ہیں - یہ پانی پت کے رہنے والے، اور جیسا کہ اِن کے نام سے ظاہر ہی مسلمان ہیں - تقریباً ۱۸۱۲ء میں دہلی کالج میں شریک ہوئے - اِس وقت اِن کی عمر ۵۹ سال کی ہی - ان کی تمام تالیفات نثر میں ہیں - اِن کو اِس بات پر فخر ہی کہ اِنھوں نے کبھی کوئی نظم نہیں لکھی - اِنھوں نے بہت بُرا بھلا کہا ہی کہ لوگوں نے ہندوستان میں شاعری کو پیشہ بنالیا ہی - اِن کی کتابوں میں بعض جدید تصانیف ہیں بعض ترجمے اور بعض تالیفات - پہلی صنف میں حسب ذیل کتابیں ہیں: ایک کتاب عورتوں کی تعلیم پر جس کے متعلق ہندوستان میں بہت غفلت کی جاتی ہی - ایک سوانح عمری ایشیا اور افریقہ کی مشہور عورتوں کی - اور ایک کتاب عروض پر جو بہت مشہور ہوئی - دوسری صنف میں یہ کتابیں ہیں: ابوالفدا کی تاریخ کا ترجمہ، ہندوستانی شاعروں کا تذکرہ اور عرب کے شاعروں کی تاریخ - تیسری صنف میں یہ کتابیں ہیں: ہندوستانی (اُردو) کے اساتذہ کے کلام کا انتخاب، ایک کتاب وراثت پر جو اسلامی شریعت میں نہایت پیچیدہ مسئلہ ہی - علوم صحیحہ پر ایک مختصر رسالہ اور دلچسپ مقولوں اور لطیفوں کی ایک کتاب جس کا نام "گلستانِ ہند" ہی -

۱۸۵۰ع کی طرح ۱۸۵۱ع میں بھی ہندوستانی مطابع ممالکِ مغربی و شمالی میں برابر کام کرتے رہے - اِس زمانے میں ہندی اور اُردو رسالے اور بہت سی کتابیں شائع ہوئیں - اِس سال پھر میرے پاس بعض دوستوں کی عنایت سے نئے مطبوعات کی فہرست پہنچ گئی ہے-

صاحبو! میں آپ کے سامنے ابتدائی رسالوں یا قدیم اساتذہ کی تصانیف یا مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا جو دوبارہ یا بار بار چھپتی رہتی ہیں، ذکر نہ کروں گا- اگرچہ اِسلامی مذہبی کتب میں سے قرآن شریف مع اُردو ترجمے کے، ایک دہلی کا اور دوسرا آگرے کا قابلِ لحاظ ہے- لیکن مذکورۂ ذیل کتابیں خاص طور پر قابلِ بیان ہیں: "تاریخِ آگرہ" جو محمد سدیدالدین نے اُردو میں لکھی ہے- "بہارِ عشق" مؤلفۂ نورعلی، یہ کتاب نل دمن کے قصے پر مبنی ہے- "قصۂ گرو چیلا"، یہ قصہ کلیلہ دمنہ کے قصے کے طرز پر لکھا گیا ہے- "قصۂ سپاہی زادہ"- "دیوانِ نوید" ایک مشہور ہمعصر شاعر کا دیوان - "دیوانِ نظیر" جو اب تک کامل نہیں چھپا تھا- "گلستاں" کا ہندوستانی ترجمہ جو پہلی مرتبہ فارسی متن کے ساتھ طبع ہوا ہے- ایک تاریخی نظم فاتحانِ ہندوستان پر مع انگریزی ترجمے کے - یہ کتاب شہنشاہِ دہلی کے حکم سے شاہی شاعر مہاراجہ اپروا کرشن بہادر نے لکھی تھی- یہ شاعر اگرچہ ہندو تھا مگر بجائے ہندی میں لکھنے کے، جو عام طور پر ہندوؤں کی زبان ہے، اُس نے اُردو میں لکھی - آخر میں ایک قصہ قابلِ بیان ہے جو علم النسل کے نقطۂ نظر سے موجبِ دلچسپی ہے اور ٹھیٹ ہندوستانی میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کے بغیر لکھا گیا ہے- اس کے لکھنے والے انشاءاللہ خاں تھے جو اِسی صدی کی ابتدا میں ایک مشہور شاعر گزرے ہیں - یہ قصہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ایک رسالے میں طبع ہوا ہے-

ہندی کی صرف اِن کتابوں کے بیان کرنے پر اکتفا کروں گا: اخلاقی مقولے موسوم بہ "نتی نیود" یا ہندو مہاجنوں کے لیے ایک کتاب جس کا نام "مہاجنی سروپکا" ہے۔ ہندی مطبوعات میں جن کی اِشاعت کی اِس سال اِطلاع دی گئی ہے، وید کے کامل ترجمے خاص طور پر قابلِ بیان ہیں جس کے ساتھ اصل سنسکرت بھی ہوگی۔

صاحبو! مجھے اُمید ہے کہ میرے لکچر ہندوستان کی جدید زبان کے علمی اور ادبی مطبوعات کے پڑھنے میں کافی طور پر رہنمائی کریں گے۔ میری تعلیم کا طریقہ جیساکہ آپ جانتے ہیں، تجزیے کے اُصول پر مبنی ہے۔ میں ہر لفظ کی تشریح کرتا ہوں اور متن کے معنی و مطالب کے ساتھ ساتھ نحوی قواعد پر بھی نظر ڈالتا جاتا ہوں اور ہر محاورے کا تجزیہ کرتا ہوں۔ میری دانست میں یہی ایک طریقہ حقیقی اور صحیح ترقی کرنے کا ہے۔

ہم اِس سال شیر شاہ کی تاریخ کے اُس حصّے کو ختم کریں گے جو پار سال شروع کیا گیا تھا۔ شیر شاہ افغانوں کا کیخسرو (Xerxes) تھا جو اگرچہ ابتدا میں ایک گورنر تھا مگر اپنی قابلیت، اپنے کیرکٹر اور اپنے عدل و اِنصاف کی وجہ سے دہلی کے تخت پر قابض ہوگیا۔ ابھی وہ بہت کم عُمر تھا کہ اُس کے والد نے اُسے اپنے علاقے کے ایک حصّے کا اِنتظام سپرد کیا۔ والد سے رخصت ہوتے وقت اُس نے یہ الفاظ کہے: "ابّا جان! مجھے اِجازت دیجیے کہ میں جناب سے اپنے دلی خیالات کا صاف صاف اِظہار کروں۔ میری خواہش ہے کہ میں اُس ملک کی زراعت کی ترقّی میں کوشش کروں جس کو آپ نے میرے سُپُرد کیا ہے اور اُس کی فلاح و بہبودی میں کوشاں رہوں۔ مگر میں اپنے مقصد میں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں ہر مُعاملے میں عدل و اِنصاف سے کام نہ لوں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ عدل اعلیٰ ترین نیکی ہے۔ اِس سے سلطنتوں کو

وُسعت اور اِستحکام حاصل ہوتا ہے۔ اور اِسی سے خزانہ مالا مال اور شہر اور قصبے آباد و خوش حال ہوتے ہیں۔ ظُلم اِس کے برعکس ہے اور بدترین عیوب میں سے ہے۔ یہ تباہی و بربادی کا موجب ہوتا ہے اور جو اِس کا مرتکب ہوتا ہے وہ دنیا و عاقبت میں ذلیل و رسوا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر بادشاہ کا فرض ہے کہ اپنی رعایا کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے اور اُن کی خبر گیری کرے کیوں کہ خدا نے رعایا کو بادشاہوں کی پناہ میں دیا ہے جن کا فرض ہے کہ اُن کو ظُلم و اِستبداد سے بچائیں اور اُن کو خوش رکھیں۔ اِس کے حصول کے لیے کامل عدل اور اعلیٰ انتظام ضروری ہے۔ اچھی حکومت کے نہ ہونے سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور رعایا کے حقوق تلف ہوتے ہیں۔ اچھی حکومت کی مثال اُس بارش کی سی ہے جو زندگی بخشتی ہے اور بغاوت کے گرد و غبار کو دبا دیتی ہے، اور وہ اُس تلوار کے مانند ہے جس کے جوہر کا عکس سلطنت کے رُخسار پر پڑتا ہے اور اُس کو مثل آفتاب کے منوّر کر دیتا ہے۔

"میں اِس امر سے ناواقف نہیں ہوں کہ بعض عہدہ دار جو میرے ماتحت کام کے لیے تجویز کیے گئے ہیں ظُلم اور سختی کو جائز رکھتے ہیں۔ میں سب سے اوّل اُن کو نرمی سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ میرے کہنے پر عمل کریں گے تو مجھے سختی نہیں کرنی پڑے گی لیکن اگر کچھ ایسے ہوں گے جن میں یہ خرابی اِس درجے سرایت کیے ہوئے ہے کہ وہ اُن سے نہیں چھوٹ سکتی تو میں سختی میں کوتاہی نہ کروں گا اور اُن کو ایسی سزا دوں گا جو دوسروں کے لیے باعثِ عبرت ہو گی۔ جب بدنظمی پھیلانے والے بدطینت لوگ سلطنت کی آگ کو شعلہ زن دیکھتے ہیں تو چھپے رہتے ہیں۔ برخلاف اِس کے جب اُنھیں ذرا سی بھی بدنظمی اِنتظامِ مملکت میں نظر آتی ہے تو ہر جگہ فساد پیدا کرتے ہیں اور حکومت کی عمارت

بہت جلد شکستہ ہو جاتی ہی - حکیموں نے کہا ہی کہ مملکت مانند ایک درخت کے ہی جس کی جڑوں کی آبیاری ہمیشہ اچھے نظم و نسق سے کرنی چاہیے تاکہ وہ امن و امان اور اطمینان کے ثمر سے بار آور ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

صاحبو! میں اِس سال "پریم ساگر" کی بھی تشریح کروں گا - پریم ساگر ایک کہانی ہی جو مسجّع اور مقفّیٰ عبارت میں لکھی گئی ہی اور جگہ جگہ اُس میں نظم بھی آتی ہی - یہ کہانی کرشن جی کے حالات سے متعلق ہی اور بھاگوت کے دسویں باب سے ماخوذ ہی - اِسی "پران" کے ترجمے شائع کرنے کا کام ایک مشہور ہندی کے عالم نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا - وہ اِسی دسویں باب تک پہنچا تھا کہ موت نے علم و ادب کے اِس سرمایۂ ناز کو ہم سے چھین لیا - لیکن ایک اور کتاب جو ہندی نظم میں ہی اور اِسی دسویں باب کے تتبّع میں لکھی گئی ہی اور پریم ساگر سے بھی قدیم ہی فرانسیسی زبان میں حال میں موسیو تھامس پاوی M. T. Pavie نے طبع کرائی ہی - مجھے اِس بات کا فخر ہی کہ موسیو موصوف میرے شاگردوں میں ہیں - اِس کتاب کا نام "کرشن جی اور اُن کی تعلیم" ہی - اِسے ایوجین بورنوف کی کتاب کا تتمہ سمجھنا چاہیے -

"پریم ساگر" ایک نہایت دلچسپ افسانہ ہی جو معلوم ہوتا ہی کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مقدس تاریخ سے لیا گیا ہی - اِس کے ہر صفحے میں عیسائی مذہب کے واقعات کا مُبہم سا اِعادہ نظر آتا ہی لیکن اِتنا فرق ہی کہ وہ سچ ہی اور یہ غلط - اِسی لیے باوجود دونوں کی مشابہت کے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں - کرشن جی کی تاریخ اگرچہ مشرقی تخیّل کے عجائبات سے پُر ہی اور غیر مسیحی اخلاقی خرابیوں نے اُسے خراب کر دیا ہی تاہم عیسیٰ مسیح کی تاریخ سے بہت مشابہت رکھتی ہی - یہ وہ بات ہی جسے میں نے اپنی ایک تصنیف میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہی اور

Un... Library
Ac... 109396

اگرچہ میرا یہ خیال عیسائی ہونے کی بنا پر تھا مگر میں نے دیکھا کہ یہ مقابلہ مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچانے کے بجائے کتاب کی وقعت کو اور بڑھا دے گا۔ مجھے یہ بات بہت دلچسپ معلوم ہوئی کہ کرشن جی کی زندگی کے حالات عیسیٰ مسیح کے حالات کی صدائے بازگشت ہیں اور اُن کی تعلیم عیسائی مذہب کے اُصول کا ایک عکس ہی۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ عیسائی مذہب ہندوستان میں بہت پہلے پھیل چکا تھا جیسا کہ ہماری مذہبی روایتوں سے بھی ظاہر ہی۔ سینٹ فرانسیس زیویر جو پیرس یونیورسٹی کا مشہور طالب علم تھا اور "انڈیز کے مبشّر" کے لقب سے مشہور ہی، جب کوچین اور ٹراونکور کے ساحلی قصبوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے پہنچا تو اُس نے وہاں کے اصلی باشندوں کو عیسائی مذہب کا پیرو پایا، جن کو اُس زمانے کے وقائع نویسوں نے "پروا" کے نام سے موسوم کیا ہی۔ اُس نے مقام میلاپور میں سینٹ تھامس کی قبر بھی دیکھی۔ یہاں میں اِس بات کا اشارہ بھی کرنا چاہتا ہوں کہ صوبۂ بیجاپور میں جس کے بڑے شہروں میں دگوا، بھی ہی سینٹ مذکور کو ہندوستانی کی دکنی بولی میں وعظ کرنا پڑا ہوگا۔ یہ بولی بیجاپور میں اُسی طرح مروّج ہی جس طرح مرہٹی۔

چوتھا خطبہ

۲۹ نومبر ۱۸۵۳ء

صاحبو! ہندوستانی زبان، جیساکہ آسانی سے معلوم ہوسکتا ہے، صرف بول چال ہی میں استعمال نہیں ہوتی بلکہ اُس ملک میں روز بروز تحریر کے کام میں بھی ترقی کرتی جاتی ہے جسے ہم انڈیا (ہندوستان) کہتے ہیں جو وسعت میں اُسی قدر بڑا ہے جس قدر برِاعظم یورپ۔ اِسی طرح اُس کا علمِ ادب ترقّی کر رہا ہے اور اچھی اچھی تالیفات و تصنیفات سے مالا مال ہو رہا ہے۔

سنہ ۱۸۵۱ء سے نئے سنگی مطبعے قائم ہوئے ہیں جہاں سے عمدہ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ نئے رسالے اور اخبار بھی جاری ہوئے ہیں اور پُرانے تقریباً سب کے سب زندہ ہیں۔

اُس اطلاع کی بِنا پر جو میرے دوستوں اور ایک انگریزی اخبار (فرینڈ آف انڈیا) نے اپنی عنایت سے مجھے بہم پہنچائی ہے میں ممالکِ مغربی و شمالی کے اُن مطابع کے متعلق صحیح تفصیل آپ کے سامنے بیان کرسکتا ہوں جو ۱۸۵۲ء کے آغاز میں وہاں جاری تھے۔ ممالکِ مغربی و شمالی، رقبے میں فرانس سے دوچند ہیں اور وہاں کی زبان ہندوستانی ہے، خواہ اُردو ہو یا ہندی۔ افسوس ہے کہ میں آپ کو راجپوتانہ، دکن، اودھ اور انگریزی اِحاطوں کے تینوں دارالحکومتوں کے متعلق کوئی نئی بات نہیں بتا سکتا۔ تاہم جو جزوی تفصیل میں آپ کے سامنے پیش کروں گا اُس سے آپ اُس ادبی تحریک کا اندازہ کرسکیں گے جو اُس زبان کے

ذریعے سے، جس کے حاصل کرنے کے لیے آپ یہاں آئے ہیں، ہندوستان میں حقیقی طور پر ظاہر ہو رہی ہے۔ نیز آپ پر ظاہر ہو جائے گا کہ زمانۂ دراز سے ہندوستانی نے خاصی حیثیت اور اہمیت حاصل کر لی ہے۔

سنہ ۱۸۵۲ع کے آغاز میں ممالکِ مغربی و شمالی کے پندرہ شہروں میں ۳۴ سنگی مطبعے تھے جن میں ہندوستانی مطبوعات شائع ہوتی تھیں اور ۳۱ ہندوستانی رسالے اور اخبار تھے۔ مطبعوں کی تفصیل یہ ہے: سات آگرے میں۔ چھے دہلی میں۔ دو میرٹھ میں۔ دو لاہور میں۔ سات بنارس میں اور ایک ایک سردھنے، بریلی، کانپور، مرزا پور، اندور، لدھیانہ، بھرت پور، امرتسر اور ملتان میں۔

اِن مطبعوں سے مفصلۂ ذیل ہندوستانی اخبار شائع ہوتے ہیں:۔ آگرے سے "مطبع الاخبار"، جو شہر آگرے میں خوب بِکتا ہے، "اخبار الحقائق"، جو ہفتے میں دو بار شائع ہوتا ہے اور "اسد الاخبار"، جو ہفتے میں ایک بار نکلتا ہے۔ ایک اور اخبار اِسی شہر سے نکلتا ہے جس کا نام "قطب الاخبار" ہے، جس میں مذہبِ اِسلام کے متعلّق بحث ہوتی ہے۔ اِس میں اخبار (احادیث)، اِسلام، انبیاء، شُہدا اور اولیاے اِسلام کے حالات شائع ہوتے ہیں اور قدیم مصنّفین کی کتابوں میں سے اِقتباسات بھی درج کیے جاتے ہیں۔ "معیار الشعرا"، ایک ادبی رسالہ ہے جس میں قدیم و جدید شُعرا کا کلام درج ہوتا ہے۔

"اخبار النواح"، پہلے ایک علمی پرچہ تھا۔ مگر اب معمولی خبروں کا اخبار ہے۔ "آگرہ گورنمنٹ گزٹ"، کا ذِکر بھی مناسب خیال کرتا ہوں۔ یہ سرکاری اخبار ہے اور ہندوستانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اب اگر ہم دِلّی کی طرف رجوع کریں تو وہاں "سراج الاخبار"، ہے جو اِس شہر کا سب سے پُرانا اخبار ہے۔ "دہلی اُردو اخبار"، اُردو میں چھپتا ہے۔ "مظہر الحق"، کے اڈیٹر ایک صاحب

محمد علی ہیں جن کی اِسی نام کی ایک تالیف ہے جس میں مذہبِ اسلام کی مختلف رسموں کا ذکر ہے۔ "قِران السعدین"، ایک باتصویر اخبار ہے جس میں سائنس، ادب اور سیاست سے بحث ہوتی ہے۔ اِس کے چند نمبر جو میرے پاس آئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتصویر رسالہ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ہم وطنوں میں مغربی معلومات کو شائع کرے۔ اِس میں خبریں بھی چھپتی ہیں۔ ہفتے میں ایک بار پیر کے روز شائع ہوتا ہے؛ اور ایک ماہانہ رسالہ بھی جس کا نام "فوائد الناظرین" ہے۔ اِس میں علاوہ خبروں کے مضامین بھی چھپتے ہیں جو انگریزی ذرائع سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ "دقیق الاخبار" ہندوؤں کا ہے۔

میرٹھ میں دو ہندوستانی اخبار ہیں۔ ایک "مفتاح الاخبار" جس کے اڈیٹر محبوب علی ہیں۔ اِنھوں نے ہندوستانی "لغت اللغات" کا خلاصہ بھی لکھا ہے جو لکھنؤ میں سنہ ۱۸۴۷ء میں طبع ہوا۔ دوسرا "جامِ جہاں نما" ہے؛ یہ جمشید کے اُس پیالے کی طرف اِشارہ ہے جس کی تہ میں وہ دنیا کے تمام واقعات جو گزرتے تھے، معلوم کرلیتا تھا۔ اِس اخبار میں عِلاوہ معمولی خبروں کے سرکاری گزٹ اور ممالکِ مغربی و شمالی کی عدالتِ عالیہ (سوپریم کورٹ) کے فیصلوں کے اِقتباسات بھی درج ہوتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ایک ورق بطور ضمیمے کے شائع ہوتا ہے جس میں فیضی کی مہابھارت کا فارسی ترجمہ شائع ہوتا ہے۔ یہ ضمیمہ اخبار کے خریداروں کو مُفت نذر کیا جاتا ہے۔

بنارس میں چھے ہندوستانی اخبار ہیں۔ اِن میں سے دو اخباروں کا ایک ہی اِڈیٹر ہے۔ ایک ہندی یعنی دیوناگری حروف میں دوسرا اُردو یعنی فارسی حروف میں شائع ہوتا ہے۔ پہلے کا نام "بنارس اخبار" ہے۔ سُنا ہے کہ راجہ نیپال سے اِمداد ملتی ہے جن کی رانی بنارس میں رہتی ہیں۔ بہرحال اڈیٹر جو ایک

پُرجوش ہندو ہی اِن دونوں اخباروں میں عیسائی مشنریوں کے خلاف ہندو مذہب کی پُر زور حمایت کرتا ہے - بنارس کا تیسرا ہندوستانی اخبار "سُدھاکر اخبار" ہے - یہ اخبار جو انگریزی حکومت کو اچھا سمجھتا ہے پہلے ہندی اُردو دونوں زبانوں میں نکلتا تھا مگر اب صرف ہندی میں شائع ہوتا ہے - اِس کی ہندی دقیق اور سنسکرت کے الفاظ سے بھری ہوتی ہے - اِس کی اشاعت صرف تعلیم یافتہ ہندوؤں تک محدود ہے - چوتھا اخبار "باغ و بہار" ہے جس کا نام اِسی نام کی مشہور کتاب پر رکھا گیا ہے یہ مہاراجہ بنارس کی سرپرستی میں نکلتا ہے - مہاراجہ جدید ادب کے بڑے مُربّی ہیں اور بہت سی کتابیں اُنھوں نے اپنے خرچ سے چھپوائی ہیں اور خود بھی ہندوستانی اور فارسی کے شاعر ہیں - پانچواں اخبار "سائرینِ ہند" (؟) ہے - یہ دو ہفتے میں ایک بار چھوٹی تقطیع کے آٹھ صفحوں پر چھپتا ہے اور ہر صفحے میں دو کالم ہوتے ہیں - علاوہ معمولی خبروں کے جو کسی قدر تفصیل سے لکھی جاتی ہیں اِس میں مختلف قِسم کے مضامین ہوتے ہیں - چھٹا اخبار "بنارس ہرکارا" ہے جو ۱۸۵۰ع سے اب تک نکل رہا ہے -

بریلی سے "عمدۃ الاخبار" شائع ہوتا ہے - اِس کے اِڈیٹر لکشمن پرشاد ہیں - اِنھوں نے چھوٹی سی علمی اور اخلاقی سائیکلوپیڈیا بھی لکھی ہے اور اُس کا نام مشرقی طرز پر "دماغی زینت" رکھا ہے -

مرزا پور سے "خیر خواہِ ہند" نکلتا ہے - یہ امریکی پروٹسٹنٹ مشنریوں کا اخبار ہے اور اِس کا مقصد تبلیغِ مذہب ہے -

"شملہ اخبار" شملے سے شائع ہوتا ہے - یہ بہت اچھا اخبار ہے جسے آج کل شیخ عبداللہ مرتّب کرتے ہیں - یہ انگریزی ہندوستانی دونوں سے واقف ہیں - ہندوستانی اِن کی مادری زبان ہے -

اِندور کا اخبار، جو مالوے کا دارالحکومت ہی، "مالوا اخبار" ہی۔ یہ آٹھ صفحوں کا ہفتہ واری ہی۔ اِس کے ایک کالم میں اُردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہی۔ اِس کے اڈیٹر دھرم نرائن ہیں جن کی عمر صِرف چھبیس ستائیس سال کی ہوگی۔ یہ بہت اچّھے شاعر ہیں اور انھوں نے مل کی پولیٹکل اِکانمی (معاشیات) اور انگلستان کی ایک تاریخ کا ترجمہ بھی کیا ہی۔

بھرت پور صوبۂ آگرہ میں ہی۔ وہاں کا اخبار "مظہرالسرور" ہی جو راجہ بھرت پور کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہی۔ "مالوا اخبار" کی طرح اِس کے ایک کالم میں اُردو اور دوسرے میں ہندی ہوتی ہی۔

اب ہم پنجاب کے اخباروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اُن کے ناموں کے دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہی کہ وہ روشنیِ علم کی اِشاعت میں زیادہ کوشاں ہیں، کیوں کہ وہاں کے اخبارات کے ناموں کے ساتھ اکثر نوٗر کا لفظ لگا رہتا ہی مثلاً "دریاے نوٗر"، جو لاہور کا اخبار ہی۔ ایک دوسرا جو ہفتے میں دو بار شائع ہوتا ہی "کوہِ نوٗر" ہی۔ یہ اُس مشہور ہیرے کا نام ہی جو آج کل ملکۂ انگلستان کے قبضے میں ہی۔ لُدھیانے کا اخبار "نورٌ علیٰ نور" ہی جسے محمد حسین نے سنہ ۱۸۵۱ع میں جاری کیا تھا۔ یہ اپنی ایک نظم کی وجہ سے مشہور ہیں جس میں اُنھوں نے فطرت کی اُن پیداواروں کو منظوم کیا ہی جن کا ذکر احادیث میں آیا ہی۔ امرتسر سے "باغِ نوٗر"، اور مُلتان سے جو اِسی نام کے صوبے کا دارالحکومت ہی "ریاضِ نوٗر" نکلتا ہی۔

صاحبو! اب میں ہندوستانی تالیفوں اور تصنیفوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو ممالکِ مغربی و شمالی میں سنہ ۱۸۵۱ع میں شائع ہوئیں۔ میں اُس معلومات میں جو میں نے گزشتہ سال آپ کے سامنے پیش کی، کچھ اضافہ کرنا

چاہتا ہوں۔
رومن کیتھلک نقطۂ نظر سے سر دھنا اِن صوبوں میں ایسا ہی جیسے صحرا میں نخلستان۔ یہاں رومن کیتھلک مشنریوں نے مطبع قائم کر رکھا ہی جس میں حال میں علاوہ اور چیزوں کے مذہبی عقائد کی سوال و جواب کی کتاب بھی چھپی ہی۔ یہ آگرے والی کتاب سے زیادہ تفصیلی ہی۔ کئی کتابیں دعاؤں کی اور فلیوری کے تاریخی سوال و جواب کا ترجمہ عیسائی اولیا کے تذکرے اور کئی اور مذہبی کتابیں فارسی اور دیوناگری حروف میں چھپی ہیں۔
پروٹسٹنٹوں کے مذہبی مطبوعات بلاشُبہہ بہت زیادہ ہیں اور اُن کی اِشاعت سے اہلِ ہند میں رفتہ رفتہ عیسائی خیالات کی اِشاعت ہوتی جاتی ہی اور اُسی کے ساتھ ابتدائی کتابیں جو انگریزی سے ترجمہ کی جاتی ہیں مغربی عُلوم کے پھیلانے میں مدد دیتی ہیں۔
گزشتہ سال میں نے آپ سے رام چندر کے عیسائی ہونے کا ذکر کیا تھا اور میں نے اپنے خطبے میں اُس اخبار کا بھی ذکر کیا تھا جس کے وہ اڈیٹر ہیں۔ اِس سال ایک ہندوستانی شاہزادے کا ذِکر کرتا ہوں اور صِرف یہی ایک ہندوستانی شاہزادہ ہی جو ہمارے زمانے میں عیسائی ہؤا ہی۔ یہ مہاراجہ دلیپ سنگھ لاہور کے شاہی خاندان کا سکھ شاہزادہ ہی۔ اِس نے فتح گڑھ میں گزشتہ مارچ کی آٹھویں تاریخ کو عیسائی مذہب قبول کیا۔ اِس وقت وہ فتح گڑھ ہی میں مقیم ہی۔
لیکن ہمیں ہندوستان کے مطابع کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھنی چاہیے، کیوں کہ یہی سب سے بڑی چیز ہی جو یورپ کی توجہ کی مستحق ہی۔ سنہ ۱۸۵۱ع کے دوران میں تیس دیسی مطبعوں میں جس قدر کتابیں چھپی ہیں اُن کا ایک گوشوارہ

تیار کیا گیا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ اُن کی تعداد ۱۲۶ ہی جن میں سے ۸۴ ہندوستانی ہیں - افسوس ہی کہ اِن میں سے متعدّد کتابوں کے صِرف نام لکھے ہیں؛ دوسری کسی قِسم کی کیفیت درج نہیں اور محض نام سے کتاب کے متعلق صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا، کیوں کہ مشرقی کتب کے نام بعض اوقات اصل مضمون سے کچھ تعلق نہیں رکھتے - اِس لیے، حضرات! میں بعض کتابوں کا تذکرہ کرنے سے معذور ہوں - ممکن ہی کہ اِن کا جاننا بہت دلچسپ ہوتا۔

ہندی کتب میں سے لائق ذِکر مفصلۂ ذیل کتابیں ہیں جو آپ کی توجہ کی محتاج ہیں -

"راماین کی شرح"، جو مہاراجہ بنارس کی فرمائش سے طبع ہو رہی تھی، جنوری ۱۸۵۲ع میں تکمیل کو پہنچ گئی - "سُجان چرتر" - یہ کتاب راجہ بھرت پور کے حکم سے طبع ہوئی - اِس میں اُس لڑائی کا منظوم تذکرہ ہی جو سورج مل (جو راجہ بھرت پور کے بزرگوں میں سے تھے) اور صلابت خاں اور دوسرے افغان سرداروں میں ہوئی تھی -

"نجات المومنین"۔ باوجود عربی نام کے یہ کتاب پنجاب کی ہندی بولی میں، جسے پنجابی کہتے ہیں، لکھی گئی ہی اور لدھیانے میں چھپی ہی-

"حاتم طائی"، ہندی منظوم بنارس میں چھپی - ایک ہندی لُغت مرتّبہ "تعشّق" دہلی میں چھپی ہی - یہ صاحب کئی کتابوں کے مؤلف ہیں، جو اِس سے قبل شائع ہوچکی ہیں - اگر میں سرکاری مطبوعات، جنتریوں اور چھوٹی چھوٹی مذہبی کتابوں، نیز ایسی کتابوں کو جو دوبارہ چھپی ہیں اپنے تبصرے میں شریک کرلوں تو یہ فہرست بہت طویل ہوسکتی ہی-

یہی کیفیت اُردو مطبوعات کی ہی جن کی تعداد اِن سے کہیں زیادہ ہی،

کیوں کہ ہندی مصنّفین بھی زبان کی اُسی شاخ میں لکھنا پسند کرتے ہیں جسے مسلمان مصنّفین نے قابلِ تعریف کمال تک پہنچا دیا ہے۔

صاحبو! اِس سال میں اُردوٗ مطبوٗعات میں سے چند ایسی کتابوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، جو حقیقی طور پر قابلِ قدر ہیں۔

کان پور کا مطبع ہندوستانی مطابع میں بہت ہی معروف و مقبوٗل ہے۔ سنہ ۱۸۵۱ء میں اِس مطبع میں عِلاوہ دوسری کتابوں کے ایک نظم "قصۂ منصوٗر" کے نام سے چھپی ہے۔ منصوٗر ایک مشہور حکیم (صوٗفی) گزرا ہے۔ جو زیادہ تر "حلّاج" کے نام سے معرُوف ہے۔ اِس مشہور شخص پر جو صوٗفی ہے سنہ ۹۲۲ع میں کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور اِس جُرم پر کہ وہ اپنے تئیں "الحق" کہتا تھا، جو خدا کا نام ہے، قتل کیا گیا۔ صوفیا اُسے شہید سمجھتے ہیں اور اُن کی تصانیف میں اِس کا ذکر بہت عزّت و حُرمت سے کیا گیا ہے۔ بعض لوگ اِسے عیسائی خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ دہربیلے نے اپنی کتاب "اورینٹل ببلیوتیک" میں اِس کے چند اشعار نقل کیے ہیں جن سے اِس بیان کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ آخری اشعار تھے جو شہادت سے پہلے اِس کی زبان سے نکلے تھے۔

"حمد ہو ہمیشہ اُس کے لیے جس نے اپنی الوہیت کو چھپاکر، جو تمام دنیا میں ساری ہے، اپنی انسانیت (انسانی شکل) کو ہم پر ظاہر کیا۔ یہاں تک کہ اُس نے خواہش کی کہ وہ ہم کو کھاتا پیتا نظر آئے۔ وہ جو مجھے اپنے دسترخوان پر بلاتا ہے تو بُرا نہیں کرتا کیوں کہ وہ مجھے وہی پیالا پینے کو دیتا ہے جو وہ خود پیتا ہے۔ وہ درحقیقت مجھ سے ایسا ہی برتاؤ کرتا ہے جیسا ایک میزبان اپنے مہمان کے ساتھ کرتا ہے"۔

عِلاوہ اِس کے اِس مطبع سے مفصلۂ ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں:-

"مجموعۂ مثنوی" یہ اُردو منظوم حکایتوں کا مجموعہ ہے۔ "حکایتِ نصیحت آمیز: نازونیاز" یہ خدا اور رسولِ خدا (صلعم) کی حمدوثنا میں ہے۔ یہ اُسی قسم کی کتاب ہے جو آگرے میں "نظمِ نادر" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ "گلستانِ مسرت"[1] یہ شعرا کے کلام کا مجموعہ ہے جو اس مطبع کے روشن خیال مالک نے انتخاب کیا ہے۔

اب اُن اُردو کتب کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرتا ہوں جو دوسرے مطبعوں سے شائع ہوئی ہیں۔ اِن میں سے ایک عربی کی مشہور کتاب "مقاماتِ حریری" کا اُردو ترجمہ ہے۔ دھرم سنگھ کا قصّہ، جو ایک دلچسپ قصّہ ہے۔ بوعلی قلندر رح کی فارسی مثنوی کی شرح۔ "بہارستانِ سخن" جو ناسخ، آتش، آباد کے کلام کا مجموعہ ہے۔ "میزانِ عقبیٰ" یہ فارسی کتاب کا ترجمہ ہے تاکہ لوگ کثرت سے مستفید ہو سکیں۔

اِس سال کے شروع میں پنجاب کے ایک اخبار نے ایک جدید کتاب کی اِطلاع شائع کی ہے۔ یہ میجر ایڈورڈ کی کتاب "پنجاب میں ایک سال" کا ترجمہ ہے۔ اِس کے مترجم نواب امام الدین ہیں جو پہلے کشمیر کے گورنر تھے اور جنھوں نے کابل کے محاصرے اور دوسری لڑائیوں میں نمایاں کام کیے ہیں۔

مَیں اُن جغرافی نقشوں کا ذِکر نہیں کروں گا جو مختلف مطبعوں میں چھپے ہیں۔ ہرکلاتس اور تیسن کے نقشوں کے بعد سے ممالک مغربی و شمالی کے مطابع میں نہ صِرف دُنیا کے نقشے بلکہ ہندوستان اور ہر ضلع کے نقشے چھپ کر شائع ہوئے ہیں۔

مَیں اپنے درسوں کے دوران میں کئی سال تک "ہندوستانی انتخابات"

---

[1] [یہ فارسی شعرا کے کلام کا انتخاب مضامین کی ترتیب سے ہے۔ پروفیسر موصوف غلطی سے اِسے اُردو خیال کرتے ہیں۔ عبدالحق]

پڑھاتا رہا ہوں - یہ عمدہ اِنتخاب فاضل مسٹر شکسپیر کا کیا ہوا ہی اور اُس وقت ایسٹ انڈیا
کمپنی کے کالجوں کے نصاب میں داخل تھا - اب اِس کی جگہ "توتا کہانی" اور
"باغ و بہار" رکھی گئی ہیں - اِس سال میں اِن کتابوں کی تعلیم دوں گا، نہ صِرف
اُن انگریزوں کے فائدے کے خیال سے جو میرے لکچروں میں آتے ہیں بلکہ
اِس خیال سے کہ اُردو میں اِن کتابوں کا طرزِ تحریر نہایت پاکیزہ اور لطیف
ہی - یعنی یہ ہندوستان کی اُس خوب صورت زبان میں لکھی گئی ہیں جس میں فارسی
اور اس کی معین عربی اعتدال کے ساتھ شریک ہی - اِن کتابوں میں استعارات
اور دیگر صنائع و بدائع اور لفظی مناسبات کا صِرف ایک حد تک استعمال کیا گیا ہی
یہ وہ چیزیں ہیں جن کے اہلِ مشرق بہت شائق ہیں -

اِن میں سے پہلی کتاب سے آپ واقف ہیں کیوں کہ اُس کا ترجمہ "توتا کہانی"
Tales of a Parrot کے نام سے ہو چکا ہی - لہٰذا اُس کے متعلق مجھے کچھ زیادہ
کہنے کی ضرورت نہیں - دوسرا ایک مشہور قصّہ ہی جسے ہندوستان میں مختلف
ناموں سے کئی صاحبوں نے لکھا ہی - اِن میں "باغ و بہار" بہت مقبول ہوا -
اور اس نام سے بار بار چھپا ہی - اِس کا ایک ترجمہ ارمنی زبان میں بھی ہوا ہی -
علاوہ اور باتوں کے اِس کی ایک خوبی یہ بھی ہی کہ اِس میں اُردو ہندی کی بہت سی
ضرب المثلیں اور اشعار بھی جگہ جگہ آتے ہیں - اِس کا نام "باغ و بہار" کسی قدر
عجیب ہی - خود مصنّف نے اپنے دیباچے میں اِس کی وجہ تسمیہ اِن الفاظ میں
بیان کی ہی :-

"ہم نام و ہم تاریخ اِس میں نکلتی ہی - تب میں نے یہی نام رکھا جو
کوئی اِس کو پڑھے گا گویا باغ کی سیر کرے گا" جیسا کہ اکثر مشرقی کتابوں میں
پایا جاتا ہی - اِس قصّے میں کئی اور قصّے شامل ہیں اور Orlando Furioso

کی طرح قصّے کا انجام عام ہی جس میں قصّے کے تمام خاص اشخاص شریک ہیں۔ یہ کتاب کئی شخصوں کی عجیب و غریب آپ بیتیوں کا مجموعہ ہی جن میں عجائب نگاری کی شان ہر جگہ پائی جاتی ہی اور باوجود بار بار اِعادے کے اہلِ مشرق اِسے بہت پسند کرتے ہیں مگر اِس سے درحقیقت اکثر اوقات قصّوں کا لُطف کم ہو جاتا ہی۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہی کہ یہ قصّہ اِسلامی روایات پر مبنی ہی جو دل و دماغ کے لیے زیادہ قابلِ قبول اور لُطف آمیز ہیں۔

صاحبو! میں اب آپ سے "باغ و بہار" کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ آپ کے خیال میں کتاب کا ایک تصوّر پیدا ہو جائے اور اصل کتاب کے پڑھنے میں آسانی ہو[1]۔

میں نے مختصر طور سے "باغ و بہار" کا خاکہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہی۔ لیکن اِس کتاب کے پڑھتے وقت آپ بہت مفید اور کارآمد بات یہ پائیں گے کہ اِن قصّوں میں ہر صفحے پر آپ کو قومی خصوصیات کے متعلق ایسی باتیں ملیں گی جو ہمیں اصلی ہندوستان اور خاص کر اِسلامی ہندوستان کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہوں گی۔ اِس قسم کی باتیں قصّے کے ہر صفحے میں پائی جاتی ہیں اور اِس میں شک نہیں کہ بعض جگہ مذہبی جوش اور ظُلم کی کارستانیاں اِس ناگوار طریقے سے بیان کی گئی ہیں کہ وہ حصّے کسی قدر خلافِ قیاس معلوم ہوتے ہیں، لیکن بہت سے حصّے ایسے ہیں کہ اُن کا جوڑ بڑی خوب صورتی سے بٹھایا گیا ہی اور درحقیقت بہت دلچسپ ہیں۔

صاحبو! اِس کتاب میں آپ اُس زبان کا مطالعہ کریں گے جو ہندوستانی کہلاتی ہی اور اِس میں آپ اُن الفاظ کو نہیں پڑھیں گے جن کا کوئی مفہوم نہیں، بلکہ

---

[1] [اِس کے بعد کتاب کا خلاصہ ہی جو غیر ضروری سمجھ کر ترجمے میں چھوڑ دیا گیا۔ مترجم]

ایسے الفاظ دیکھیں گے جو اُن اشیا کا مفہوم بتاتے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں، اور جہاں تک الفاظ کا تعلّق ہے آپ اِس کے علاوہ ایک اور بات بھی پائیں گے اور وہ یہ ہے کہ اِس کے الفاظ خیالات کی نیابت کرتے ہیں، کیوں کہ اُن کا تجزیہ کرنے سے ہم اُن مادّوں تک پہنچتے ہیں جو انڈو یوروپین زبانوں کے ایک بہت بڑے مجموعے کی کنجی ہیں اور خود ہماری زبان بھی انھیں میں شامل ہے اور درحقیقت ہندوستانی کی ایک بہن ہے۔

پانچواں خطبہ

۴ دسمبر ۱۸۵۴ء

سنسکرت جو قدیم آریاؤں کی زبان تھی، ہندوستان کی (جسے ویدوں میں سپت سندھو یعنی سات دریاؤں[1] والے ملک سے موسوم کیا گیا ہی) کبھی عام زبان نہیں ہوئی تھی - سنسکرت کے ڈراموں میں یہ خاص اور بڑے اشخاص کی زبان ہی - عورتیں اور عوام ایک دوسرے قسم کی بولی "پراکرت" استعمال کرتے تھے - پراکرت کے معنی غیر شائستہ اور سنسکرت کے معنی شائستہ کے ہیں[2] جیسا کہ بعض ہندوستانی مصنفین نے ہم کو باور کرایا ہی[3] - پراکرت ہمیشہ دہلی میں بولی جاتی تھی، اور "بھاشا" یا "بھاکا" یعنی دیسی زبان کہلاتی تھی - سنسکرت سی قوی اور غالب زبان نے اِس کو چلا دی اور "ہندوستانی زبان" (ہندی) کے نام سے موسوم ہوئی - یہ نام سنسکرت کو کبھی حاصل نہیں ہوا تھا[4] -

---

[1] یعنی پانچ دریا پنجاب کے اور سندھ اور سرسوتی -

[2] ڈراما نویسی سے قبل بدھ مت کی تصانیف اور راشوک کے کتبے ایک قسم کی پراکرت ہی میں لکھے گئے تھے جو اُس وقت مقبول زبان تھی -

[3] "باغ و بہار" اور "آثار الصنادید" کے دیباچے ملاحظہ ہوں -

[4] البتہ بعض عرب مصنفین نے بول چال کی زبان اور تحریری زبان میں اِمتیاز نہیں کیا اور دونوں کو گڈمڈ کر دیا ہی - میں نے کسی جگہ لکھا ہی کہ لاطینی زبان میں بھی ایسا ہی ہوا ہی جو رومن زبان سے کبھی موسوم نہیں کی گئی تھی - یہ نام صرف اولڈ فرنچ (قدیم فرانسیسی) کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہی، جو کہ عہد وسطی میں سہل کر کے بنائی گئی تھی اور گالز Gauls کی قدیم زبان کے بچے کھچے لفظوں سے اُسے سنوارا گیا تھا -

پہنچے۔
سنہ ۱۰۰۰ع کے آغاز ہی میں مسلمان ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے
محمود غزنوی نے سنہ ۱۰۰۰ع کے لگ بھگ سب سے بڑھ کر شاندار فتوحات حاصل
کیں اور اُسی وقت سے شہروں میں ہندوستانی 'بھاکا' میں تغیر واقع ہوا - چارسو
سال بعد تیمور لنگ جو قوم کا مغل تھا[1]، ہندوستان میں داخل ہوا، دہلی کو فتح کیا
اور زبردست سلطنت کی بنیادیں ڈال دیں جس کو آخر کار بابر نے سنہ ۱۵۰۵ع
میں مستحکم کیا - اُس وقت ہندوستانی زبان (ہندی) فارسی زبان میں بالکل گھل مل
گئی جس میں عرب فاتحوں کے تسلّط اور مذہب کی بدولت بے شمار عربی الفاظ
داخل ہوگئے تھے اور اِس عجیب وغریب آمیزش سے ہندوستانی آریائی اور سامی
لہروں کا سنگم بن گئی جو ایک قسم کی نہایت غیر معمولی لسانی ترکیب ہے[2]۔
اس طرح دوہری ہند اِسلامی زبان وجود میں آگئی، یعنی شمالی زبان
اور جنوبی زبان - شمال کی ہندوستانی کو اُردو[3] کا نام ملا کیوں کہ اُس
نے شاہی اُردو (لشکر) میں جنم لیا تھا اور جنوب یا دکھن کی
زبان دکھنی کہلائی - لیکن ہندی فنا نہیں ہوئی - وہ فارسی یا عربی الفاظ کی آمیزش
بغیر "دیوناگری"، تحریر میں ایسے ہندوؤں میں جاری رہی، جنھیں مسلمانوں سے
ملنے کا (خاص کر دیہات میں) شاذ و نادر ہی اتفاق ہوتا تھا - غرض اِس طرح
دو ہندوستانی زبانیں ہو تو گئی تھیں ایک، لیکن پیرایہ مختلف تھا؛ گویا وحدت

---

[1] یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی، دہلی کی مسلمان سلطنت کو مغل سلطنت کہتے ہیں اور بادشاہ کو مغل اعظم کہا کرتے تھے - ماسوا ہندوستان میں مغل کا خطاب اُن تمام مسلمانوں کو دیا جاتا ہے جو شمال سے آئے خواہ وہ نسلاً ایرانی تھے یا تاتاری -

[2] میرا مقصد عربی سے ہے کیوں کہ اصلی فارسی الفاظ ہندی زبان کے خاندان میں شامل ہیں -

[3] زبان اُردو "لشکر کی زبان" ہے جیسا کہ آئندہ چل کر معلوم ہوگا -

میں دوئی کا رنگ تھا[1]۔

ہندوستانی زبان یا ہندوستانی (یعنی ہندوستان کی زبان) کی یہ تفریق (یعنی ہندی اور اُردو) مذہب نے پیدا کی ہے اور اس لیے عام طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندی، ہندؤوں کی اور اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔

یہ ایک مسلّم امر ہے کہ جن ہندؤوں نے اُردو زبان میں تالیف وتصنیف کی ہے، مسلمانوں کے طرز کی نقل کی ہے بلکہ مسلمانوں کے تخیّلات کو بھی جذب کیا ہے اور اُن کی نظموں کو پڑھ کر یہ پہچاننا کہ یہ کسی ہندو کی ہیں، بہت مشکل ہے۔

عموماً ہندی نظمیں اُردو اور دکھنی نظموں کی نسبت زیادہ پُرزور ہوتی ہیں۔ وہ قدیم عربی نظموں سے مشابہ ہیں، جن میں یہی صفات پائی جاتی ہیں۔ٹامسن کا وہ شعر جو حُسن پر ہے، دونوں پر صادق آتا ہے:۔

"اُسے بیرونی آرایش سے مرصّع ہونے کی حاجت نہیں ہے،
بلکہ بغیر آرایش کے ہی وہ نہایت آراستہ معلوم ہوتی ہے[2]"

ایک عرصۂ دراز تک ہندو ادبی مضامین سنسکرت میں اور مسلمان فارسی میں لکھتے رہے اور عام زبان عام پسند گیتوں میں استعمال کرتے رہے،

---

[1] ایم۔جے۔بیمس، مصنّف ہندی لسانیات مجھے مطلع فرماتے ہیں کہ حال کی مردم شماری کی رو سے سات کروڑ ہندوستانیوں سے زائد ایسے ہیں جن کی مادری زبان ہندوستانی ہے، اِس کے علاوہ یہ تمام ہندوستان اور قرب وجوار کے ممالک میں سمجھی جاتی ہے۔ آنریبل مسٹر ارسکن پیری پریسیڈنٹ ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی نے اُس سوسائٹی کے جنوری نمبر سنہ ۱۸۵۳ء میں ایک دلچسپ مضمون "جغرافیہ کی رُو سے ہندوستان کی خاص زبانوں کی تقسیم"، کے عنوان سے لکھا ہے اور اُس کے ساتھ ہی ایک نقشہ بھی دیا ہے جس سے ایک نظر میں یہ بیان صاف سمجھ میں آجاتا ہے۔

[2] (از موسم، خزاں)۔ باغ و بہار میں ایک شعر ہے جو اِسی مضمون کو اِس سے زیادہ خوبی سے ادا کرتا ہے:۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے ۔۔۔ کہ جیسے خوشنما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے

لیکن شدہ شدہ مستند اور مشہور تصانیف نے ہندوستانی زبانوں کو ایک حالت میں قائم کر دیا، جن میں بقول ایک عالم ہندیات (ولسن) کے ایک وافر اور نہایت دلچسپ ادب کا ذخیرہ پایا جاتا ہے[51]۔

حال کے ایک مصنف سید احمد نے اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں "اُردو زبان کا بیان" کے عنوان سے اِس بارے میں یہ لکھا ہے[52]۔

ہندؤوں کے راج میں تو یہاں ہندی بھاشا بولنے چالنے، لکھنے پڑھنے میں آتی تھی۔ سنہ ۵۸۷ ہجری مطابق سنہ ۱۱۹۱ عیسوی موافق سمت ۱۲۴۸ بکرماجیت کے جب مسلمانوں کی سلطنت نے یہاں قیام پکڑا تو بادشاہی دفتر فارسی ہو گیا، مگر زبان رعایا کی وہی بھاشا رہی۔ سنہ ۸۹۴ھ مطابق سنہ ۱۴۸۸ع تک بجز بادشاہی دفتر کے رعایا میں فارسی کا رواج نہیں ہوا۔ اِس کے چند روز بعد سلطان سکندر لودی کے عہد میں سب سے پہلے ہندؤوں میں سے کائستوں[53] نے جو ہمیشہ سے اُمورات ملکی اور ترتیب دفتر میں مداخلت رکھتے تھے فارسی لکھنا پڑھنا شروع کیا؛ پھر رفتہ رفتہ اور قوموں نے بھی شروع کر لیا اور فارسی لکھنے پڑھنے کا ہندؤوں میں بھی رواج ہو گیا۔

اگرچہ بابر اور جہاں گیر کے عہد تک ہندی بھاشا میں کچھ تغییر و تبدیل نہیں ہوئی تھی، مسلمان اپنی گفتگو فارسی زبان میں اور ہندو اپنی گفتگو بھاشا میں کیا کرتے تھے۔ پر جب بھی امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں کے زمانے

---

[51] میں نے یہ الفاظ اپنی کتاب "تاریخ ہندوستانی ادبیات" میں تمہید کے طور پر استعمال کیے ہیں۔

[52] صفحہ ۱۰۴۔ باب سوم

[53] اِس لفظ کی تشریح آگے کی جائے گی۔

یعنی حضرت مسیح سے تیرھویں صدی میں فارسی زبان میں بھاشا کے لفظ ملانے
شروع کیے تھے اور کچھ پہیلیاں اور مکریاں اور نسبتیں[1] ایسی زبان میں کہی
تھیں جس میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے۔ غالب ہو کہ رفتہ رفتہ بھاشا میں
جب ہی سے ملاپ شروع ہوا ہو مگر ایسا نہ تھا جس کو جدا زبان کہا
جائے۔ جب کہ شاہ جہاں بادشاہ نے سنہ ۱۰۵۸ھ مطابق سنہ ۱۶۴۸ع
کے شہر شاہ جہاں آباد آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا، اُس
زمانے میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا بہت مل گئی اور بعضے فارسی
لفظوں اور اکثر بھاشا کے لفظوں میں بہ سبب کثرتِ اِستعمال کے تغیر و
تبدیل ہو گئی۔ غرض کہ لشکر بادشاہی اور اُردوے معلّی[2] میں اِن دونوں
زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہو گئی۔ اور اِسی سبب سے
زبان اُردو نام ہوا۔ پھر کثرتِ استعمال سے زبان کا لفظ محذوف
ہو کر اس زبان کو اُردو کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ اِس زبان کی تہذیب اور
آراستگی ہوتی گئی، یہاں تک کہ تخمیناً سنہ ۱۱۰۰ھ مطابق ۱۶۸۸ع کے
یعنی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شعر کہنا شروع ہوا۔

اگرچہ مشہور ہو کہ سب سے پہلے اِس زبان میں وؔلی نے شعر کہا مگر
خود ولؔی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہو کہ اُس سے پہلے بھی کسی نے
اِس زبان میں شعر کہا ہو کیوں کہ اُس کے شعروں میں اور شاعروں

---

[1] اِس لفظ کی تشریح آگے کی جائے گی۔

[2] اُردوے معلّی کے لفظی معنی بڑے لشکر کے ہیں۔ لیکن یہ لفظ بڑے بازار کے مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ پرانے مصنفین کا یہ بیان ہو کہ اِس بازار میں مسلمان اور ہندو سپاہیوں کے میل جول سے یہ لسانی اِختلاط پیدا ہوا۔

کی زبان پر طنز نکلتی ہی۔ مگر اُس زمانے کے شعر بہت پھیکے اور نہایت
سُست بندش کے تھے؛ پھر روز بروز اس کو ترقی ہوتی گئی؛ یہاں تک
کہ میر[1] اور سودا نے اُس کو کمال پر پہنچا دیا"۔

بہر کیف اِس آخری دَور سے قبل حاتم اپنے "دیوان زادہ" کے دیباچے
میں جو اُنھوں نے ۱۷۵۰ع میں مرتب کیا، لکھتے ہیں:۔

"میں نے تحریر کے لیے وہ زبان اختیار کی ہی جو ہندوستان کے تمام
صوبوں میں مستعمل ہی یعنی ہندی، جس کو بھاکا[2] بھی کہتے ہیں کیوں کہ عوام
اِس کو سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ خواص میں بھی مقبول ہی"۔

بہر حال جو کچھ سیّد احمد کہتے ہیں وہ پورے طور پر صحیح تسلیم نہیں کیا
جاسکتا۔ بات یہ ہی کہ اہلِ مشرق میں تخیل اِس قدر زیادہ ہوتا ہی کہ وہ کسی مسئلے
کے تمام پہلوؤں پر صحت کے ساتھ غور نہیں کر سکتے۔ سیّد احمد کہتے ہیں کہ مسلمانوں
کی فتوحات سنہ ۱۱۹۱ع سے سنہ ۱۶۴۸ع تک زبان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں
پیدا ہوا۔ لیکن میر امّن[3] اِس کے برعکس کہتے ہیں:

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے
سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اِس خاندانِ لاثانی کی سُن کر حضور میں
آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے

---

[1] میر نے نکات الشعرا کے دیباچے میں اِس کی طرف اشارہ کیا ہی یعنی وہ کہتے ہیں "ریختہ از دکن است"

[2] یہ لفظ ہندی کے مرادف استعمال کیا جاتا ہی، جس کے معنی عام "ہندوستانی زبان" ہیں۔ اگر صحیح صحیح کہا جائے تو ہندی قدیم ہندوستانی بھاکا ہی جس میں عربی یا فارسی کا کوئی میل نہیں ہی اور دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہی۔ ہندی، حال کی جدید ہندو زبان ہی۔

[3] دیباچۂ باغ و بہار۔

ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔

اور مزید یہ کہ گیارھویں صدی کے اختتام سے قبل غالباً ۱۰۸۰ء میں مسعود بن سلمان[1] نے اشعارِ ریختہ میں ایک دیوان لکھا جس کا مفہوم وہی معلوم ہوتا ہے جو سید احمد نے بیان کیا ہے۔ ہندی الفاظ فارسی میں رل مل گئے، جس کا مطلب دوسرے الفاظ میں اُردو زبان ہے۔ علاوہ بریں بہت سے تذکرہ نویس اشعارِ ریختہ کو سعدی[2] سے منسوب کرتے ہیں جو اُس نے ۱۰۵۰ء سے ۱۰۸۰ء تک دکن میں لکھے۔ کمال تو اپنے دیوان میں اُس کو موجد زبان ریختہ لکھتا ہے۔ لیکن "دکن یا جنوب" میں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کیوں کہ مسعود نے اُس سے ایک سو برس پہلے ریختہ میں اشعار کہے ہیں۔ بہرحال اُس سے ایک سو سال بعد ہی خسرو اور نوری نے ریختے میں غزلیں کہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد پھر جنوب ہی میں اُس بولی میں جسے دکنی کہتے ہیں، ریختہ اشعار لکھے گئے۔ یہی طرز آخرکار شمالی (ہندوستان) کے شاعروں نے اپنی نظموں کے لیے اختیار کیا، وہاں اِس سے قبل تک عام طور سے

---

[1] [یعنی مسعود بن سعد بن سلمان۔ ع۔ ص۔]

[2] اصل تذکروں میں بیان کیا گیا ہے کہ سعدی نے سو برس کی عمر پائی (پیدائش ۱۱۹۳ء وفات ۱۲۹۶ء) اور تیس سال تعلیم میں، تیس سال سفر میں اور تیس سال گوشہ نشینی میں گزارے اگر بچپن کے ۱۲ سال تعلیم کے تیس سال میں ملائے جائیں تو ۴۲ سال ہوتے ہیں لہذا ۱۰۵۰ء سے ۱۰۸۰ء تک اُنھوں نے سفر کیا۔ اور کلام ریختہ جو اُن سے منسوب کیا جاتا ہے اُس وقت کہا ہوگا جب کہ وہ سفر کر رہے تھے۔

[مصنف کا یہ خیال صحیح نہیں۔ یہ سعدی شیرازی نہیں بلکہ دوسرا شخص ہے جو اس تخلص کا اسی ملک میں ہوا ہے۔ عبدالحق]

فارسی مستعمل تھی۔ پس سولھویں صدی میں ہم بہت سے نامور شعرا کے نام پاتے ہیں۔ مثلاً شاہانِ گولکنڈہ میں قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ۔ اِن کے علاوہ افضل ولی، غوری[1] غواصی، رسمی[2] وغیرہ ہوئے ہیں۔ شمالی ہند کے شعرا نے کہیں اٹھارھویں صدی عیسوی میں شہرت حاصل کی۔ حاتم جو سترھویں صدی کے آخر میں ہُوا دہلی کا غالبًا پہلا شاعر ہی جس نے اُردو میں لکھنا شروع کیا اور وہ اِس کا اقرار کرتا ہی کہ اُس نے عام زبان (اُردو) میں لکھنے کا اُس وقت فیصلہ کیا جب کہ ولی کا دیوان دہلی پہنچا اور پھر (شمال کے) دیگر شعرا نے اُس کی تقلید کی۔

۱۸۲۸ع سے جب کہ نامور گلکرسٹ نے جو انگریزوں میں ہندوستانی زبان کی تعلیم اور مطالعے کا بانی ہُوا ہی اپنی اُردو قواعد میں ایک تذکرے کا حوالہ دیا، مجھے اِس زبان کی ادبی تاریخ کا شوق پیدا ہُوا۔ متواتر تحقیق اور تلاش سے مجھے سات تذکرے دستیاب ہوئے اور باوجود ناکافی سامان کے میں نے ہندوستانی ادب کی تاریخ لکھی، جو اگرچہ ایک نامکمل تالیف ہی لیکن اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب ہی اور ۱۸۳۹ع میں شائع ہوچکی ہی۔ اِس کتاب کا ہندوستانی زبان میں بھی ترجمہ ہوگیا ہی اور اُس سے انگریز مستشرقوں میں بھی اِس زبان سے شوق پیدا ہوچلا ہی۔ اُن کی اور میری تحقیقات نے مل کر بہت سے نئے تذکروں کا پتا چلایا مگر میں اُن سے زیادہ استفادہ نہ کرسکا کیوں کہ اُن میں متعدد تذکرے ایسے ہیں

---

[1] [مصنف، ابن نشاطی کا دوسرا نام غوری بتاتے ہیں۔ آئندہ اوراق میں بھی اُنھوں نے ابن نشاطی کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہی لکھا ہی، ابن نشاطی کی کسی کتاب میں یہ نام نہیں۔ مصنف کو غلط فہمی ہوئی ہی۔ عبدالحق]

[2] [صحیح "رستمی" عبدالحق]

جو اب تک دستیاب نہیں ہوئے اور بعض کا پتا صرف اِس طرح لگا کہ بعض مصنفین نے اُن کا حوالہ اپنی کتابوں میں دیا ہی۔ ابھی بہت سے ایسے ہوں گے جن کا نام و نشان مجھے اب تک معلوم نہیں ہؤا ہی۔

اِس سے بآسانی یہ قیاس ہو سکتا ہی کہ اِس کتاب کے جدید اِڈیشن کے لیے میرے پاس کس قدر جدید سامان مہیا ہو گیا ہی، لیکن اِس وقت میں مختصراً صرف اُن تذکروں اور کتابوں کا ذکر کروں گا جو میں اِن ذرائع سے معلوم کر سکا ہوں۔

اہلِ ایران اور اُن کے تتبع میں ہندی مسلمان سوانح (اور خاص کر ہم عصر لوگوں کے سوانح) لکھنے کے بہت شوقین تھے، اور جیسا کہ ہمارے ہاں کا حال ہی، اِن میں صرف تاریخ وفات مفقود نظر آتی ہی۔ لیکن یہ تذکرے بجاے تجارتی مفاد کے ادب کا اہم جز ہیں۔ اِن تذکروں میں مشہور مؤلفین اور دوستوں کی مدح سرائی دل کھول کے کی جاتی ہی اور اِس حیلے سے اُنھیں اپنی فصاحت و بلاغت اور انشا پردازی دکھانے کا خوب موقع ملتا ہی اور عمدہ عمدہ اشعار انتخاب کرکے اپنے ذوقِ سلیم کا اِظہار کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ تذکرے ایک قسم کے منتخبات (یا بیاض) ہیں، جن میں شعرا کی زندگی کے حالات پُرشکوہ اور شاندار مدح سرائی تک محدود ہوتے ہیں جو بعض اوقات مسلسل کئی کئی صفحے تک چلے جاتے ہیں اور اکثر اُن میں سواے شاعر کے نام کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات مدح کے بعد دس، بیس، تیس صفحے تک شعروں کا اِنتخاب ہوتا ہی اور کبھی صرف دو ہی تین شعر نمونے کے دے دیے جاتے ہیں اور کبھی صرف ایک ہی شعر ہوتا ہی۔ تذکرہ نویس اِن تذکروں میں اپنی روشناسی اور شہرت کا بھی پہلو نکال لیتے ہیں۔ بعض مصنّفین یا شعرا کا ذکر کرتے کرتے اپنا نام بھی کہیں نہ کہیں لے آتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ اپنے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھتے ہیں، جنھیں دیکھ کر یہ آرزو پیدا ہوتی ہی

کہ کاش وہ دوسرے شعرا کے حالات بھی اسی طرح لکھتے ؛ اور اپنے اشعار نقل کرنے میں بھی کبھی نہیں چوکتے ۔ یورپ میں سوانح عمری کے مولف کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، مصنّفین یا شعرا کے ذاتی حالات تفصیل سے بیان کیے جائیں۔ اِس کے برخلاف ہندوستانی تذکروں میں شاعروں کے ذاتی حالات کی تفصیل مطلق نہیں ہوتی ۔ صحت کا بھی بہت کم خیال کیا جاتا ہے ۔ اُن شاعروں کو قدیم کہا جاتا ہے جو کسی دوسرے سے پہلے گزرے ہیں اور مؤلّف اپنے ہم عصروں کو شعرائے جدید لکھتا ہے ۔ تاریخ اور سنہ اور خاص کر تاریخ پیدائش اِن تذکروں میں شاذ و نادر ہی ہوتی ہے، کیوں کہ اہل مشرق پیدائش کا رجسٹر نہیں رکھتے اور عموماً اپنی عمر نہیں جانتے ۔ اِس لیے شاعر کے اشعار کی زبان دیکھ کر قیاس کرنا پڑتا ہے کہ یہ کس زمانے یا کس صدی کا شخص ہے، لیکن اِس میں بھی بڑی دشواری واقع ہوتی ہے کیوں کہ کتابوں کی نقل در نقل میں بہت سے الفاظ کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔

بہر حال اِن تذکروں کے مؤلف بہت ہی کم درجہ اور بعض اوقات گم نام شعرا کے ناموں سے اپنی کتابوں کو ضخیم بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہی حال ہمارے ہاں کے سوانح لکھنے والوں کا ہے جو اپنی تالیف کا حجم بڑھانے کے لیے کھود کھود کے گم نام لوگوں کا حال لکھتے ہیں ۔ ایسے ہی موقع کے لیے کوپر نے یہ شعر لکھے ہیں :۔

> "ایسے بے حقیقت ناموں کو، جو بھولنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں، غیر فانی
> شہرت دینے کی کوشش سعیِ لاحاصل ہے ۔ تاریخوں میں اُن کا ذکر کرنا کہ
> آئندہ نسلیں اُن کی طرف متوجہ ہوں، محض بیکار ہے"۔

ایسے تذکرے، ظاہر ہے، عمدہ تنقید کے نمونے نہیں ہو سکتے ۔ اِن تذکروں میں جہاں کہیں ایک ہی نام کے دو یا کئی شاعر آجاتے ہیں، وہاں بڑی پریشانی لاحق ہوتی ہے اور تفصیلی حالات نہ ہونے کی وجہ سے صحیح اور قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

تاہم یہ تذکرے ایک خاص قسم کی تالیف ہیں، جو دلچسپ بھی ہیں اور قابل قدر بھی، اور یہی وجہ ہو کہ بہت سے لوگوں نے اِس قسم کی تالیفات پر طبع آزمائی کی ہو۔ اِن تذکروں میں ضمناً ایسی باتیں نکل آتی ہیں جو ہندوستان کی ادبی تاریخ کے لیے اہم ہیں۔ مثلاً اِن کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ ہندوستانی، ادب و شعر کی ترقی کے لیے مشاعرے کرتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی ادبی مجلسیں ہیں جو شاعری کی مشق اور ذوق پیدا کرنے کے لیے کی جاتی ہیں؛ جہاں شعرا اور اہلِ ذوق میں فی البدیہہ یا پہلے سے کہے ہوئے اشعار میں خوب خوب مقابلہ ہوتا ہو۔ ایسی مجلسیں ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں منعقد ہوتی ہیں، جن میں عموماً پندرہ یا بیس شخص ہوتے ہیں؛ یہ سب اچھے پڑھے لکھے اور ممتاز خاندانوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ مولوی کریم الدین نے، جن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا، کچھ عرصہ ہوُا ایک خاص رسالے "گل رعنا" میں جو دہلی سے شائع ہوُا ہو ایسے مشاعروں کی نظموں وغیرہ کا ذکر کیا ہو۔ اِن کے علاوہ ایسی مجلسیں بھی ہوتی ہیں جہاں قصہ خواں، قصّے سنا سنا کر، لوگوں کو رجھاتے ہیں۔ اِنھیں قصّہ خوانوں میں ایک مرزا حسن تھے، جو قومی قصے بڑی خوبی سے بیان کیا کرتے تھے۔ یہ قصّے قلم بند کر لیے گئے ہیں[1]۔

اِن تذکروں میں ترتیب حروف ابجد کے لحاظ سے ہوتی ہو۔ اور یہ ترتیب تخلّصوں کے اِعتبار سے کی جاتی ہو۔ لیکن بعض میں ترتیب مختلف بھی ہوتی ہو۔

بہت سے ہندوستانی تذکرے فارسی میں لکھے گئے ہیں، کیوں کہ کچھ عرصہ پہلے تک اخلاقی [اور علمی] کتابیں اِسلامی ہند کی علمی زبان میں تالیف ہوتی تھیں۔ پہلے ہمارے ہاں بھی یہی حال تھا، مثلاً دیوبوا (سلویُ اُس) نے فرانسیسی زبان کی نحو لاطینی میں لکھی اور پیٹرارک نے اپنی اِطالوی نظموں کی شرح لاطینی میں

---

[1] سکریٹری انجمن ترقی دیسی تعلیم کی رپوٹ ۱۸۴۵ع کی پہلی ششماہی کی بابت۔ مرتبہ ڈاکٹر اشپرنگر۔

تالیف کی تھی -

اِسی خیال سے کہ ہندوستانی تذکروں کی خوبیوں اور نقائص کا کامل اندازہ ہو سکے (اور اِن تذکروں میں خوبیوں سے نقائص زیادہ ہوتے ہیں) میں یہاں دو بیان نقل کرتا ہوں - یہ دونوں لُطف (مرزا علی خاں[1]) کے تذکرے "گلشن ہند" سے لیے گئے ہیں - ایک اِن میں سے مختصر ہی، دوسرا طویل -

مختصر بیان نامور شاعر حاتم کا ہی جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں اور جس کے حالات دوسرے تذکرہ نویسوں نے کسی قدر تفصیل سے بیان کیے ہیں -

"حاتم تخلص، شاہ جہان آبادی، اور مشہور ریختہ گویوں میں سے دلّی کے تھا؛ ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور مرزا رفیع سودا کا - شاعر خوش بیان تھا، صاحب دو دیوان تھا - ایک دیوان میں خرج ایہام کیا ہی، اور دوسرا بطرزِ متاخّرین سرانجام کیا ہی - جامع ہی طورِ متاخّرین اور طرزِ ایہام کا۔"

(اِس کے بعد اُس کے کلام میں سے بیس شعر کا اِنتخاب کیا ہی جس کا نمونہ میں پہلے دے چکا ہوں) -

دوسرا بیان شاہ ابوالحسن بادشاہ گولکنڈہ کا ہی جو ۱۰۸۰ھ (۷۳-۱۶۷۲ع) میں تخت پر بیٹھا اور جب اورنگ زیب نے ۱۶۹۰ع میں گولکنڈہ فتح کیا تو قید کر لیا گیا اور اُسی حالت قید میں ۱۷۰۴ع میں اِنتقال کر گیا - وہ اپنے پیشرو عبداللہ قطب شاہ کی طرح ہندوستانی کا شاعر ہی نہ تھا بلکہ ہندوستانی ادب کا سرپرست بھی تھا - اور منجملہ اُس کے دوسرے عہدہ داروں کے مرزا ابوالقاسم کی نسبت بیان کیا جاتا ہی کہ وہ اپنے زمانے میں دکن کے مشہور شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا۔

"نام نامی اور اِسم گرامی اِس بادشاہِ عشرت دوست کا ابوالحسن تاناشاہ ہی-

---

[1] [مصنف نے شاید دھوکے سے "خاں" لکھ دیا ہی - ع - ص -]

سلاطین نامدار اور خواقین عالی مقدار دکھن سے تھا۔ اگرچہ شہرہ عیش ونشاط کا اور آوازہ مسرت وانبساط کا اِس عیشِ مجسم کا ماہ سے ماہی تک مشہور ہی، لیکن کچھ تھوڑا سا احوال اِس سریر آرائے بارگاہِ عیش وکامرانی کا یہاں لکھنا ضرور ہی۔

جن ایام کہ عالمگیر خلد مکان نے عادل شاہی اور نظام شاہیوں کو زیر و زبر کیا اور صوبۂ دکن کو بعد بہت سی خرابی کے لیا، تو ابوالحسن تاناشاہ بھی نظربندی میں آئے اور فلک نیرنگ باز نے بدلے اُس عیش وعشرت کے اور ہی رنگ دکھائے۔ سامانِ عیش سب برہم ہؤا اور مجمعِ اربابِ نشاط حلقۂ ماتم ہؤا۔ خلد مکان نے جس قدر تنگی اِن کے اوقات میں چاہی، اِنھوں نے قبول کیا، لیکن حقّے کے مقدمے میں بہت سماجت کے ساتھ اِتنی بات کہلابھیجی کہ اِس کا شوق مجھے نہایت ہی، جو رعایت کہ اِس کے سامان میں ہوگی وہ عین عنایت ہی۔

ازبسکہ یہ بادشاہ عشرت دوست آٹھ پہر نشۂ عیش میں مخمور رہتا تھا، حقّہ ایک دم منہ سے نہیں چھٹتا تھا، اور یہ بھی معمول تھا کہ بعد ہر چلم کے ایک شیشے سے گلاب کے حقّہ تازہ ہووے، پھر ایک شیشے میں بیدمشک کے حقّہ بردار نیچے کو بھگووے۔ شغل میں عیش و نشاط کے ازبسکہ راتوں کو کم سوتے تھے، سینکڑوں شیشے گلاب خالص اور عرق بیدمشک کے دن رات میں خرچ ہوتے تھے۔ یہ سب احوال مفصّل خلد مکان کو معلوم تھا۔ علاوہ اِس کے بادشاہ نے اِس عجز سے کہلا بھیجا، بارے سولہ شیشے گلاب کے اور آٹھ شیشے بیدمشک کے حکم فرمائے اور مطابق حکم عالی کے سرکار اعلیٰ سے کئی دن بمعرض وصول بھی آئے۔

سُبحان اللہ ! یا تو حقّہ آٹھ پہر منہ سے نہیں چھٹتا تھا، اور اُن کے دُود محفل کے رشک سے دھواں حسد کا حقّہ سر آسمان میں گھٹتا تھا، یا پیچ سے فلکِ حقّہ باز کے آٹھ چلمیں دن رات میں یہ پیتے تھے اور گھونٹ گھونٹ کر عجب پیچ و تاب کے ساتھ جیتے تھے۔

اِس میں بعد کئی دن کے حضرت خلد مکان نے فرمایا کہ سولہ شیشے گلاب اور بید مشک کے ہر روز حقّے کے مصرف میں آنے اِسراف ہی، اور اُمورات شرعی میں پاسِ خاطرِ بیجا بے جا اور تکلّفِ رسمی معاف ہی[1]، آٹھ شیشے ہر روز یہاں سے جایا کریں۔ ایک شیشے سے بعد ہر چلم کے حقّہ تازہ کر کے آٹھ چلمیں دن رات میں پییں۔

جب حضور سے ہر روز آٹھ شیشے آنے لگے تو یہ دن رات میں لاچار چار چلموں سے دِل بہلانے لگے۔ یہ ماجرا سُن کر خلد مکان نے ضد کے مارے چار شیشوں کی اور تخفیف کی۔ اِنھوں نے اپنے حقّہ بردار کو دو چلموں کی پروانگی دی۔ بعد کئی دن کے جب دو شیشے اور کم ہوئے تو ایک چلم دِن رات میں یہ پیا کرتے تھے۔ جس دِن اُن دو شیشوں کا آنا بھی موقوف ہوُا، بعد تین دِن کے حقّہ بردار نے عرض کی کہ فدوی نے جہاں پناہ کی دولت سے اِتنا کچھ بعد خرچ کے جمع کیا ہی کہ دس چلمیں روز اِسی خرچ کے ساتھ سالہا سال پلا سکتا ہی، اُمید ہی کہ بھیڈی خانے کے خرچ کا غلام کو حکم ہووے کہ نہال نمک حلالی کا زمین میں سرخروئی کے بووے۔ اِرشاد فرمایا کہ حضرت اعلیٰ کو اُمورات شرعی کا بہ شدت

---

[1] پکّے مسلمان کھانے اور لباس میں بیجا تکلفات سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ قہوے اور تمبا کو نیز دوسری قسم کے عیش و عشرت سے بھی جس کا تانا شاہ عادی تھا، اِجتناب کرتے ہیں۔

دھیان ہی؛ اگرچہ مسجد کا کھود ڈالنا، خزانہ اُس کے نیچے گڑا مُن کر، نہایت آسان ہی۔ تو جو ہمارے مصرف بیجا کا کفیل ہوتا ہی، ابھی ایک دم میں جمع پونجی کھو کے سر پر ہاتھ دھر کے روتا ہی۔ غرض اُس دن سے پھر حقہ نہ پیا، جب تک کہ اُن کی نظربندی میں رہے اور اِس سرائے فانی سے عالم باقی کو تشریف لے گئے۔

سبحان اللہ! چشم حقیقت بیں سے اگر کوئی دیکھے تو دنیا جلے حسرت ہی، بلکہ خانۂ زحمت۔

کدھر ہیں خسرو جم لطفِ کیقباد کدھر؟
کہاں سکندر و دارا کہاں ہی کیکاؤس؟
جو مستِ جاہ ہیں دیکھیں وہ چشم عبرت سے
کچھ اُن کے ساتھ گیا، غیرِ حسرت و افسوس۔

اگرچہ ملک گیری اور کشورستانی کے معاملے کو سمجھنا شاہانِ عالی تبار پر ختم ہُوا ہی، گدائے گوشہ نشین کو دخل اِن اُمورات میں کیا ہی۔ لیکن بعضے دانشمند کہتے ہیں کہ خلد مکان نے اِستیصال بادشاہان دکن کا جو اِس محنت سے کیا اور مکہ مسجد کو کھدوا کے[1] وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا۔ خدا جانے اِس حرکت کا کیا مفاد ہی۔ تحصیلِ حاصل سے بھی اِس میں کچھ کیفیت زیادہ ہی۔ کس واسطے کہ پیش از تسخیرِ دکن کے بھی خراج و باج اُس طرف سے چلا آتا تھا اور بادشاہ ہندوستان کا، شہنشاہ کہلاتا تھا۔ مآل اِس مشقّت کا اُعجوبہ نظر آیا کہ اِس تردّد نے شاہنشاہ کو بادشاہ کر دکھایا۔

---

[1] [مکہ مسجد حیدر آباد کا کھدوانا خلاف واقعہ ہی۔ عبدالحق]

واقف رموزِ ملک سے ہیں شاہ وشہریار
ہر تو گدائے گوشہ نشیں لطف کچھ نہ بول[51]

غرض شاہ عالی جاہ ابوالحسن تانا شاہ کی طرف لوگ۔ اِس مطلع کو منسوب کرتے ہیں اور باعتبار محاورۂ دکن کے اور بندش قدیم کے، کہ اِس مطلع میں ہر، ابراہیم خاں مرحوم[52] بھی گفتگو پر لوگوں کی گوش دل کو دھرتے ہیں۔ مطلع یہ ہر:۔

کس[53] در کہوں، جاؤں کہاں، مجھ دل پو بھل بچھراٹ ہر
اک باٹ گے ہوں گے سجن، یاں جی ہی بارہ باٹ ہر۔"[54]

اگرچہ جنوب کی ہندوستانی بولی یعنی دکنی میں بمقابلۂ شمالی بولی یعنی اُردو کے طویل نظمیں پائی جاتی ہیں، شمالی زبان یا اُردو میں زیادہ تر غزلیں، قصیدے یا چھوٹی چھوٹی مثنویاں دیوانوں میں محفوظ ہیں، تاہم شمال کی زبان کو ہمیشہ

---

۵۱ [مصنّف نے حافظ کے اِس شعر کا ترجمہ کیا ہر:۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
(عبدالحق)]

۵۲ مصنّف تذکرۂ گلزار ابراہیم۔

۵۳ [قائم نے یہ مطلع عبداللہ قطب شاہ سے (جو ابوالحسن تانا شاہ کا خسر اور اُس سے قبل حکمران تھا) منسوب کرکے اِس طرح نقل کیا ہر:۔

کِس در کہوں کاں جاؤں میں مجھ دِل پہ کٹھن بچھراٹ ہر
یک باٹ گئے ہوں گے سجن یہاں جیو بارہ باٹ ہر

(پچ)]

۵۴ [اِس بیان کے ترجمے میں مصنّف سے کئی جگہ غلطی ہوگئی ہر۔ یہاں یہ تمام بیان اصل سے نقل کیا گیا ہر۔ (عبدالحق)]

تفوق حاصل رہا ہے، کیوں کہ وہ بہت باقاعدہ لکھی جاتی ہے - اور اسی لیے تمام تذکرے جن کا میں ذکر کروں گا اُردو شاعروں سے متعلق ہیں، دکنی شعرا کا ذکر محض ضمناً آجاتا ہے - میرے قول کی تصدیق میرؔ کے اُس بیان سے ہوتی ہے جو وہ نکات الشعرا کے دیباچے میں فرماتے ہیں :-

"اگرچہ ریختہ در دکن است، چوں از آنجا یک شاعرِ مربوط برنخاستہ، لہٰذا شروع بنام آنہا نہ کردہ و طبعِ ناقص مصروف اینہم نیست کہ احوالِ اکثر آنہا ملال اندوز گردد، مگر بعضے از آنہا نوشتہ خواہد شد"

ہندی شعرا کے خاص تذکرے ہیں جنھیں "کب مالا" کہتے ہیں، لیکن جس قدر میرے علم میں آئے ہیں وہ بہت ہی کم ہیں - مجھے ہندوستانی مصنّفین کے تقریباً ستّر تذکروں اور منتخبات وغیرہ کا علم ہے - یہ ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے، لیکن ہندوستان کی ادبی تاریخ میں ان سے کچھ کام نہیں لیا جاتا - اِس لیے میں اِن میں سے ہر ایک کتاب کا کچھ ذکر کروں گا[1]۔

مضمونِ زیرِ بحث کے لحاظ سے ہندی شعرا کے تذکروں کا ذکر سب سے اوّل ہونا چاہیے، اِس لیے کہ اِن میں جن شعرا کا ذکر ہے وہ مقابلتاً مقدّم ہیں -

۱- "بھگت مال" (بھگت مالا) درحقیقت وشنوی فرقے کے ایسے سادھوؤں کے تذکرے ہیں جو بھجنوں کے بھی مصنّف ہیں - ہندی دراصل ہندو مصلحین کی زبان ہے، شیو کے قدیم فرقے کے پیرو ہندی میں نہیں لکھتے، وہ سنسکرت ہی زبان کے شیدائی ہیں -

بھگت مال کے بہت سے اڈیشن ہیں، لیکن اُن کی بنیاد اُن نظموں پر ہے جو

---

[1] [اِس لکچر کو گارساں دتاسی نے بعد میں رسالے کی شکل میں علیحدہ شائع کیا - صفحہ ۶۸ سے ۱۰۰ تک جو مواد رسالے میں ہے وہ مصنّف نے بعد میں اضافہ کیا - (مترجم)]

"چوپائی" کہلاتی ہیں، اِس نام کی وجہ یہ ہی کہ اُن میں چھ مصرعے ہوتے ہیں اور ہر مصرعے میں آٹھ ماترا ہوتے ہیں جیسے "اشٹپائی" کہتے ہیں، جن میں کا آخری مصرع نظم کے شروع میں دُہرایا جاتا ہی۔ یہ نظمیں ایک قسم کے بھجن یا ہندی کے مقبول مذہبی گیت ہیں جو ہندوی یا قدیم ہندی زبان میں وشنوی سادھوؤں کی تعریف میں ہوتے ہیں۔ یہ بھجن بہت مشہور ہیں اور نابھاجی کی بدولت ہم تک پہنچے ہیں۔ نابھاجی خود سادھو منش آدمی تھے اور مادرزاد اندھے تھے۔ اُنھوں نے یہ بھگت مالا سنہ ۱۶۵۷ع میں لکھی۔ شاہ جہاں کے عہد میں (۱۶۲۸ع-۱۶۵۸ع) نرائن داس نے اِن نظموں میں کچھ اصلاح کی، پھر سنہ ۱۷۱۳ع میں کرشن داس نے اور اُس کے بعد پریاداس نے اِن میں کچھ اضافہ کیا۔ راگ ساگر نے جو زمانۂ حال کا مصنّف ہی اور جس نے "راگ کلپادرم" مرتب کی ہی (جس کا ذکر میں عنقریب کروں گا)، بھگت مال کا ایک جدید اڈیشن شائع کرنے کا اعلان کیا ہی، لیکن مجھے اِس کی اِطلاع نہیں کہ وہ اڈیشن شائع ہوا یا نہیں۔ اُردو میں بھی اِس کا ایک اڈیشن ہی لیکن مجھے اُس کا علم نہیں۔ غرض کہ اصل نظمیں مع اضافے کے بھگت مال کہلاتی ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک سوانح عمری چوپائی سے شروع ہوتی ہی اور جو نظمیں کہ بطور شرح کے ہیں وہ ٹیکا کہلاتی ہیں۔

میں اپنی کتاب "ہندوستانی ادب کی تاریخ" کی تالیف اور اشاعت کے وقت صرف کرشن داس کے اڈیشن سے اِستفادہ کرسکا۔ لیکن اب مجھے پریاداس کا قلمی نسخہ بھی دستیاب ہوگیا ہی جو یورپ میں نادر ہی۔ یہ پریاداس جس کے معنی محبوب یعنی کرشن کے غلام کے ہیں، بنگال کا رہنے والا تھا۔ اِس صوبے میں ہندو، علاوہ اپنے صوبے کی زبان بنگالی کے ہندی میں بھی لکھتے ہیں اور مسلمان مثل مسلمانان صوبجات شمال و مغربی، اُردو اِستعمال

کرتے ہیں۔ اِس شخص کا تعلق وشنویوں کے ایک خاص فرقے سے ہے جس کا بانی نتیانند تھا۔ بھگت مالا کی شرح، جس کا وہ مؤلف ہے[1]، کبت کی بحر میں ہے اور اُس کا صحیح نام "بھگت رس بودھنی" ہے، جس کے لفظی معنی "بھگتی کے رس کا علم" ہیں۔ پریاداس کے بیانات "درش تنت" کے نام سے مشہور ہیں اور بھگت مال "بھگت پرسُنیے" کے نام سے۔ یہ شخص اِس تذکرے کے اڈیشن سے اُس قدر مشہور نہیں جس قدر بھگوت کی وجہ سے جس کا یہ مصنّف ہے[2]۔

۲۔ "بھگت چرتر" (بھگتوں کی تاریخ)۔ یہ بھی بھگت مالا ہی کی سی کتاب ہے۔ اِس کا مؤلف گھوا چھدن ہے۔ یہ چودھویں صدی کا ہندی شاعر ہے اور اِس کی تصنیف سے اور بھی چند کتابیں ہیں۔

۳۔ "راگ کلپادرم"، جس کے معنی راگ کا درختِ مراد یا شجرِ بہشت ہیں۔ یہ عام مقبول گیتوں کا بہت ضخیم مجموعہ ہے (تخمیناً ۱۸۰۰ صفحے)۔ اِسے سری کرشنانند دیاس دیو نے مرتب کیا ہے، جس کے صلے میں دہلی کے بادشاہ نے اُسے راگ ساگر کا خطاب عطا فرمایا، اور یہ خطاب اب اُس کا تخلّص ہو گیا ہے۔ راگ ساگر گوڑ برہمن ہے اور علاقۂ میواڑ میں دیوگڑھ کوٹ یا اودے پور کا رہنے والا ہے۔ جو اشعار اُس نے اِس مجموعے میں جمع کیے ہیں، اُن کی تعداد بارہ لاکھ پچیس ہزار ہے۔ یہ مجموعہ کلکتے میں ۱۸۴۳ء میں چھپنا شروع ہوا اور ۱۸۴۵ء میں ختم ہوا۔ جیسا کہ مؤلف نے کتاب کے دیباچے میں بیان کیا ہے اُس نے اِن گیتوں کے جمع کرنے کے لیے بائیس سال تک سفر کیا۔ اِس شخص کی بدولت بہت سی ایسی نظمیں محفوظ ہو گئیں جو اب تک نامعلوم تھیں

---

[1] دیکھو ایچ ایچ ولسن، "ایشیاٹک ری سرچز"، جلد ۱۶، صفحہ ۵۶۔

[2] "ہندوستانی ادب کی تاریخ"، جلد اول صفحہ ۴۰۵۔

حالانکہ اُن کے مصنّف مشہور و معروف شاعر تھے۔

"راگ کلپادرم" میں کئی فصلیں ہیں، جن میں بڑی بڑی سات ہیں۔ پہلی میں مختلف راگوں کی نظمیں ہیں جو ۱٦٤ صفحے کی ہے۔ دوسری میں صرف سور ساگر ہے اور وہ ٦٠٠ صفحے کی ہے۔ تیسری میں، جو ۳٤٤ صفحے کی ہے، مختلف ہندو مسلمانوں کے گیت ہیں۔ چوتھی ۱٧٦ صفحوں کی ہے، جس میں بہار اور ہولی کے گیت ہیں۔ چوتھی کے دو حصے ہیں ایک میں دُھرپد اور دوسرے میں خیال ہیں۔ پہلا حصّہ ۲۰۸ صفحے کا اور دوسرا ۱۵٦ کا۔ چھٹی فصل میں صرف غزلیں اور ریختے ہیں جو ۱٧٦ صفحے پر ہے۔ آخری فصل میں صرف ۲۸ صفحے ہیں اور اِس میں راجہ بھرتری اور گوپی چند کا کلام ہے۔ اگرچہ یہ کتاب، جیسا کہ اِس کی تفصیل سے ظاہر ہے، ایک قسم کا مجموعۂ انتخابات ہے، لیکن اِس میں تذکرے کی بھی حیثیت ہے، کیوں کہ جن شاعروں کا مقبول کلام اِس میں درج ہے اُن کے کچھ کچھ حالات بھی لکھے ہیں۔

٤۔ افسوس ہے کہ مجھے 'سجان چرتر' کے متعلق زیادہ واقفیت نہیں۔ اِس میں دو سو سے زیادہ ہندی شاعروں کا حال ہے جو سودن گوی نے ۱٧٤۸ع میں لکھی۔

۵۔ 'کوی چرتر'۔ یہ کتاب جناردھن نے مرہٹی میں لکھی ہے۔ اِس میں کئی ہندو شاعروں کے حالات ہیں۔

اب ہم اُن تالیفات کی طرف رجوع کرتے ہیں جو صحیح طور پر تذکروں کے نام سے موسوم ہیں اور جن کا تعلق خصوصیت کے ساتھ اِسلامی ہندوستانی سے ہے۔ یعنی اُس بولی سے جو اُردو کہلاتی ہے۔

یہ تذکرے جدید ہیں جہاں تک میرا علم ہے، سب سے پُرانا گزشتہ

صدی (اٹھارھویں صدی) کے وسط میں لکھا گیا ہے۔ ان میں سے آٹھ تو گزشتہ صدی کے ہیں اور اُنیس ہماری صدی (اُنیسویں صدی) کے۔ اِن اُنیس میں سے صرف سات ایسے ہیں جو ہندوستانی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

ذیل میں اُن تذکروں کا ذکر بہ ترتیب سنہ کیا جاتا ہے۔

۶۔ جہاں تک ہمیں علم ہے، سب سے پہلا اور سب سے پُرانا میرؔ (محمد تقی) کا تذکرہ "نکات الشعرا" ہے۔ میر صاحب نہایت نامور شاعر اور مستند اُستاد ہیں۔ یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے، اور اِس میں تقریباً سو شاعروں کا ذکر ہے۔ یہ حالات مختصر مگر زوائد سے پاک ہیں اور ساتھ ہی ساتھ شعرا کے کلام پر تنقید بھی کی گئی ہے۔ میں نے اپنی کتاب ہندوستانی ادب کی تاریخ میں میرؔ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اُس پر اِس قدر اور اِضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ "میرؔ"، اُن کا تخلص تھا، تمغائے سیادت نہ تھا۔ چنانچہ شورشؔ نے لکھا ہے کہ وہ شیخ تھے، سیّد نہ تھے[۱]۔ وہ آرزوؔ کے بھانجے اور آگرے کے رہنے والے تھے۔ لیکن باپ کی وفات کے بعد وہ اپنے ماموں کے پاس دہلی آ گئے جن سے اُنھوں نے اصلاح بھی لی۔ ۱۱۹۶ھ (۸۲ - ۱۷۸۱ء) میں وہ لکھنؤ چلے گئے۔ نواب آصف الدولہ نے دو سو سے تین سو روپے تک اُن کی ماہانہ تنخواہ کردی۔ میر صاحب نے لکھنؤ ہی میں انتقال کیا اور تقریباً سو سال کی عمر پائی۔

کمالؔ، جس نے اپنا "مجموعۂ انتخاب" ۱۸۰۴ء میں مرتب کیا، لکھتا ہے کہ میر صاحب اسّی سال سے زیادہ عمر کے تھے۔ ناسخؔ نے اُن کی تاریخ وفات کہی ہے، جس سے سنہ ۱۲۲۵ھ (۱۱ - ۱۸۱۰ء) نکلتا ہے۔ اُسی سال اُن کا کلیات

---

[۱] [یہ صحیح نہیں۔ میر صاحب سیّد تھے، اُن کی خود نوشتہ سوانح عمری نے یہ مسئلہ صاف کردیا ہے۔ (عبدالحق)]

بھی طبع ہؤا۔ بہرحال تذکروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی وفات لکھنؤ میں ۱۲۱۵ھ (۰۱ - ۱۸۰۰ع) اور ۱۲۲۱ھ (۰۷ - ۱۸۰۶ع) کے درمیان ہوئی -

قاسم کا اعتراض میرؔ کے تذکرے کے متعلق یہ ہے کہ اُس میں بہت کچھ کھینچ تان سے کام لیا ہے اور میر نے اپنے ہم عصروں کے کلام پر نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن صاحب "آثار الصنادید" کی راے میرؔ کے کلام کے متعلق یہ ہے:-

"میرؔ کی زبان ایسی صاف اور شستہ ہے اور اس کے شعروں میں ایسے اچھے محاورات بے تکلف بندھے ہیں کہ آج تک سب اس کی تعریف کرتے ہیں - سوداؔ کی زبان بھی اگرچہ بہت خوب ہے اور مضامین کی تیزی میرؔ پر غالب ہے مگر میرؔ کی زبان کو اُس کی زبان نہیں پہنچتی"۔

میر نے اپنا تذکرہ مخلص کی وفات سے ایک سال قبل لکھا۔ مخلص کی وفات ۱۱۶۴ھ (۵۱ - ۱۷۵۰ع) میں ہوئی - میر صاحب خود اپنے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ اُردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے۔ "نکات الشعرا" کی عبارت یہ ہے:-

"پوشیدہ نماند کہ درفنِ ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اُردوے معلّٰی شاہجہان آباد دہلی، کتابے تا حال تصنیف نہ شدہ کہ احوالِ شاعرانِ این فن بصفحۂ روزگار بماند"۔

غالبًا یہ بیان نیک نیتی پر مبنی ہے مگر صحیح نہیں ہو سکتا، کیوں کہ یہ امر یقینی ہے کہ میرؔ کے زمانے میں پہلے سے بھی اُردو شعرا کے تذکرے موجود تھے۔ چنانچہ فتح علی حسینی اپنے تذکرے کے دیباچے میں (جس کا سنہ تالیف وہی ہے جو میرؔ کے تذکرے کا، یعنی سنہ ۱۱۶۵ھ[1] مطابق ۵۱ - ۱۷۵۰ع) لکھتا ہے کہ اُس نے یہ تذکرہ لکھنے کا

---

[1] گردیزی کے تذکرے کا سنہ تالیف ۱۱۶۶ھ ہے جیسا کہ خود اُس نے خاتمے پر لکھا ہے۔ انجمن

اِرادہ اِس لیے کیا کہ جن لوگوں نے اِس سے قبل شعرائے ریختہ کے تذکرے لکھے ہیں، اُنھوں نے محض حسد سے اُن پر نکتہ چینیاں کی ہیں، جس سے میں نے اِحتراز کیا ہے اور انصاف کو مدنظر رکھا ہے - اگرچہ یہ طنزیہ جملہ میرؔ کے تذکرے پر صادق آتا ہے[1]، تاہم وہ تذکروں کا ذکر جمع کے صیغے میں کرتا ہے اور اِس لیے اگر ہم یہ قیاس کریں تو بیجا نہ ہوگا کہ سنہ ۱۷۵۱ع میں متعدد تذکرے ہندوستانی شعرا کے موجود تھے - علاوہ اِس کے ہم کو عنقریب یہ معلوم ہوگا کہ قائمؔ، جس نے اپنا تذکرہ اِن دونوں تذکروں کے کئی سال بعد لکھا، اِس بات پر فخر کرتا ہے کہ ہندوستانی شعرا کا یہ پہلا تذکرہ ہے - غالباً سرقے کے الزام سے بچنے کے لیے اُس نے یہ سخن سازی کی ہے - کمالؔ نے اپنا تذکرہ اکبر شاعر کی فرمائش سے سنہ ۱۸۰۴ع میں تالیف کیا (اکبرؔ[2] کی وفات عالم جوانی میں سنہ ۱۸۰۳ع میں ہوئی) - اِس تذکرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے کئی سال قبل چالیس ہندوستانی تذکرے بہم پہنچائے تھے[3]- اِس بنا پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اُن تذکروں میں، جن میں سے اب ہمیں صرف ایک چوتھائی کا علم ہے، بعض میرؔ کے تذکرے سے بھی قدیم تھے[4]-

---

ترقیٔ اُردو نے یہ تذکرہ شائع کیا ہے - (چ) [مصنّف نے خود ہی پچھلے صفحے پر مخلص کی وفات ۱۱۶۴ھ میں اور "نکات الشعرا" کی تالیف اس سے ایک سال پہلے بتائی ہے یعنی ۱۱۶۳ھ اِس لیے ۱۱۶۵ھ سراسر غلط ہے - ع - ص]

[1] گردیزی نے میر صاحب کے تذکرے کو اپنا نشانۂ اِعتراض بنایا ہے - ملاحظہ ہو مقدمۂ تذکرۂ ریختہ گویاں (چ)

[2] دیکھو اکبر (اکبر علی خاں) کا بیان کمال کے تذکرے میں -

[3] اس کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انیس برس کی عمر سے یہ سامان جمع کرنا شروع کردیا تھا -

[4] [مصنف کو کمال کی عبارت کے سمجھنے میں کچھ مغالطہ ہُوا ہے - اوّل تو اُس نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ اُس نے یہ تذکرہ اکبر کی فرمائش سے لکھا - دوسرے کمال نے چالیس کے ساتھ "دواوین" کا لفظ لکھا ہے جسے مصنف نے "تذکرے" خیال کیا - تیسرے یہ سامان خود مؤلف تذکرہ نے جمع کیا تھا نہ کہ اکبر نے - کمال کی اصل عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے - یہ ذکر اکبر کے متعلق ہے "بعد از آن قریب چہل دواوین اساتذۂ ریختہ گویان کہ ہمراہ فقیر بود از یک طرف سیر ہمہ دواوین ساختہ بعد از آن خود شوق شعر گفتن آغاز نمودہ رجوع این معنی بہ فقیر آوردہ بعرصۂ چندیہ فیض کلام سخنوران کلام خود را بہ پایۂ اعتبار کشیدہ" - "رجوع این معنی بہ فقیر آوردہ" سے مطلب یہ ہے کہ "مجھ سے اصلاح لینے لگا" اِس کا مطلب مصنف نے یہ سمجھا کہ تذکرہ لکھنے کی طرف توجہ دلائی -
(عبدالحق)]

میر کی ہندوستانی نظمیں بے شمار ہیں، جن میں سے اکثر اُن کے کُلّیات مطبوعۂ کلکتہ، ۱۸۱۰ع میں موجود ہیں۔ اِس کُلّیات میں صرف فارسی کی نظمیں، جن کی تعداد کچھ زیادہ نہیں، درج نہیں کی گئیں۔ البتہ چند عشقیہ مثنویاں جو اِس کلیات میں نہیں ہیں، ”مجموعۂ مثنویات“ میں پائی جاتی ہیں۔ یہ مجموعہ سنہ ۱۸۱۵ع میں کانپور میں مصطفیٰ خاں کے اہتمام سے شائع ہوا۔ اِس میں علاوہ میر کی مثنویوں کے صادق خاں کی مثنویاں بھی شریک ہیں۔ میر کو اُس کے اہلِ وطن عام طور پر ہندوستانی شعرا میں دوسرا بڑا شاعر خیال کرتے ہیں؛ بعض اُسے سودا کا ہم رتبہ سمجھتے ہیں اور بعض قطعی طور پر اُس کے کلام کو سودا کے کلام پر ترجیح دیتے ہیں۔

۷۔ قائم نے، جو ایک مشہور شاعر ہُوا ہے، ایک تذکرہ لکھا ہے۔ اس کا نام بھی ”نکات الشعرا“[۱] ہے، جو علاوہ اِس کے ”طبقات الشعرا“ کے نام سے بھی معروف ہے، کیوں کہ اُس کی تقسیم تین طبقوں میں کی گئی ہے۔ یہ اُن تذکرہ نویسوں میں ہے جو سعدی شیرازی کو اُردو شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔

۸۔ تذکرۂ فتح علی حسینی گردیزی۔ یہ ہندوستانی مصنّف ہے۔ ذات کا شیخ اور صوفی مشرب یعنی مسلمان فلسفی ہے۔ اِس نے یہ تذکرہ دلّی میں فارسی زبان میں لکھا۔ اِس میں میر کے تذکرے کی طرح کم و بیش سو شاعروں کا ذکر ہے اور ترتیب بھی حروف ابجد کے لحاظ سے ہے۔ حسینی خود اپنے تذکرے میں اپنے تذکرے کا سنہ تالیف جتا کر بتاتا ہے۔ وہ انجام کے ذکر میں لکھتا ہے کہ اِس شاعر نے ۱۱۵۹ھ (۴۷-۱۷۴۶ع) میں یعنی اِس تذکرے کی تالیف سے چھے سال پہلے انتقال کیا، اِس حساب سے تالیف کا سال ۱۱۶۵ھ (۵۱-۱۷۵۰ع) ہوا۔ یہی سال میر کے تذکرے کی تالیف کا ہے۔[۲]

---

[۱] [قائم کا تذکرہ ”مخزن نکات“ ہے۔ مصنف نے ظاہرا بھولے سے یہاں ”نکات الشعرا“ لکھ دیا ہے۔ (چ)]
[۲] [معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر گردیزی کے تذکرے کا کوئی ناقص نسخہ تھا۔ خاتمے پر گردیزی نے صاف طور سے سنہ تالیف ۱۱۶۶ھ درج کیا ہے یعنی اُس نے ”نکات الشعرا“ کی تالیف کے ایک سال بعد اپنا تذکرہ لکھا ہے۔ (چ)]

حسینی ضرور "نکات الشعرا" سے واقف تھا۔ ایک وجہ تو وہی ہے جو میں پہلے لکھ چکا ہوں، دوسری بات یہ ہے کہ وہ اُس سے صریحًا نقل کرتا ہے۔ اُس کا دیباچہ پڑھتے ہی فورًا معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ "نکات الشعرا" سے نقل کر رہا ہے، کیوں کہ میر صاحب نے ریختے کے طرزِ تحریر پر جو رائے ظاہر کی ہے وہی اُس نے لفظ بلفظ نقل کردی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسینی سنہ ۱۸۰۶ء تک زندہ تھا، کیوں کہ قاسم نے اُس کا ذکر زندہ مصنّفین میں کیا ہے۔

۹۔ اِس کے بعد تذکرۂ "مخزنِ نکات"[۱] ہے۔ اِس کے مؤلف شیخ محمد قائم الدین 'قائم' چاندپوری ہیں۔ سالِ تالیف ۱۱۶۸ھ (۵۵-۱۷۵۴ء) ہے۔ اِس تذکرے سے بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ تین طبقات میں منقسم ہے، یعنی قدیم، وسطی اور جدید شعرا کے حالات ہیں کل شاعر جن کے حالات اِس میں درج ہیں ایک سو دس ہیں۔ سب سے عجیب بات اس تذکرے میں یہ ہے کہ مصنّف (جیساکہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے) اِس بات کا مدعی ہے کہ سب سے پہلا وہی ہے جس نے اِس مضمون پر قلم اُٹھایا ہے، جس کے یہ معنی ہوئے کہ اِس سے پہلے جس قدر تذکرے لکھے گئے تھے اُن سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ یعنی نہ صرف اُن تذکروں سے جو میرؔ سے پہلے لکھے گئے بلکہ میر اور فتح علی کے تذکروں سے بھی۔ ہمیں اِس بیان کی صداقت پر شبہہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے، مگر اِس سے کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

---

[۱] "مخزن نکات" تاریخی نام ہے۔ اکرم (شاعر) نے اِس پر تاریخی قطعہ بھی لکھا ہے۔ میرے کتاب خانے میں تذکرۂ قائم کا ایک خلاصہ ہے اور سرورق کی تحریر کے بموجب اُس میں میرؔ کے تذکرے کا خلاصہ بھی شریک ہے جو قائمؔ کے تذکرے کی بنیاد ہے، اگرچہ قائمؔ کا یہ دعویٰ ہے کہ اُسے اِس سے قبل کے کسی تذکرے کا حال معلوم نہیں۔

ایک بات جو اس سے قبل کے تذکروں میں نہیں پائی جاتی، یہ ہی کہ سعدی شیرازی نے اپنی سیاحتِ دکن کے زمانے میں اُس خطے کی زبان میں اشعار لکھے اور اس لیے اُنھیں ہندوستانی شعرا میں شمار کرنا چاہیے[1] - یہ واقعہ یقینی نہیں تو اغلب ضرور ہی - اِس بیان کی میر اور فتح علی نے تردید کی ہی، کیوں کہ اُنھوں نے یہ اشعار دکن کے ایک فرضی سعدی سے منسوب کیے ہیں[2] - کمال نے بھی اِس معاملے میں قائم کا تتبع کیا ہی، وہ اکثر اِس تذکرے سے استفادہ کرتا ہی جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا؛ شورش دوسری راے کا قائل ہی، جس نے اپنا تذکرہ قائم کے تذکرے سے دس سال بعد لکھا - دوسرے تذکرہ نویسوں نے حقیقی یا فرضی سعدی کے متعلق کچھ نہیں لکھا - اِس بحث کی یہ صورت ہی، اِس مسئلے پر میں اِس سے پیشتر مفصل بحث کرچکا ہوں[3] -

شاعر کی حیثیت سے قائم اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں خیال کیا جاتا ہی - بقول کمال سوداے کے بعد ہندی مسلمانوں کا مقبول شاعر ہی، وہ سب سے بڑھا ہوا ہی - اِس قول کی تائید میں وہ اپنے تذکرے میں قائم کے دیوان سے اس کا بہت سا کلام نقل کرتا ہی، جس میں بیانیہ، ہجویہ اور دوسری قسم کی نظمیں ہیں جو قومی خصائص کے نقطۂ نظر سے بہت دلچسپ ہیں -

شیفتہ کی راے میں قائم کی بہترین نظمیں اُس کے قطعے اور رباعیاں ہیں - باقی نظموں کے وہ اُس قدر مدّاح نہیں جس قدر کمال ہی - اُن کے خیال میں قائم کو سودا کا ہم رتبہ سمجھنا حماقت ہی - قائم اوائلِ عمر ہی میں دہلی چلا گیا تھا،

---

[1] اِس کی بحث 'ژورنال آسیاتیک'، بابت ۱۸۴۳ع میں دیکھو۔

[2] (سعدی) کے متعلق اکثر تذکرہ نویسوں کو مغالطہ ہوا ہی - یہ نہ سعدی شیرازی ہیں اور نہ دکن کے باشندے، بلکہ شمالی ہند کے رہنے والے تھے جو اکبر کے عہد میں ہوئے ہیں - تاریخ وفات ۱۰۰۲ھ ہی (عبد الحق)

[3] دیکھو 'ژورنال آسیاتیک'، بابت ۱۸۵۳ع -

جہاں وہ بادشاہ کے ہاں سلسلۂ ملازمت میں داخل ہوگیا۔ ۱۲۰۷ھ اور ۱۲۱۰ھ (۹۵-۱۷۹۳) کے درمیان انتقال کرگیا۔

۱۰- تذکرۂ ابوالحسن کا نام ''مسرّت افزا'' ہی، یہ فارسی میں ہی اور ۱۲۰۷ھ (۱۷۷۹ع) میں تالیف ہوا۔ میں نے اپنی کتاب ''ہندوستانی ادب کی تاریخ'' میں اِس امر پر افسوس ظاہر کیا ہی کہ اِس تذکرے کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے میں اِس سے اِستفادہ نہ کرسکا۔ مجھے اِس کا علم سر ولیم اوزلے کی قلمی نسخوں کی فہرست سے ہوا تھا، جن کے پاس اِس کا ایک نسخہ تھا۔[۱] اب اُن کے قلمی نسخے اکسفورڈ لائبریری میں آگئے ہیں اور میرے دوست نتھے نیل بلانڈ نے اپنی عنایت سے اُسے پڑھ کر اُس کا خلاصہ اور اُس کے اقتباسات میرے پاس بھیج دیے ہیں۔ یہ اِس لیے اور بھی کار آمد ثابت ہوا کہ ڈاکٹر اشپرنگر نے اِس کا ذکر اپنی فہرست میں نہیں کیا ہی۔

اِس تذکرے کے مؤلف کا نام ابوالحسن امیرالدین احمد ہی، جو امر اللہ الہ آبادی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ وہ اپنا وطن چھوڑ کر عظیم آباد میں جا بسے اور پھر کلکتے گئے۔ اُنھیں ہندوستانی شاعری سے ذوق تھا اور اِسی لیے اُنھوں نے بہ زمانۂ سفر ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ع) یہ تذکرہ لکھا اور لکھنؤ آکر اِس میں اضافہ کیا۔

۱۱- تذکرۂ شورش بھی فارسی میں ہی، ۱۱۹۳ھ (۸۰-۱۷۷۹ع) میں تالیف ہوا۔ اِس کا کوئی خاص نام نہیں۔ مؤلف کا نام غلام حسین ہی مگر عام طور پر میر بھینا کے عرف سے مشہور ہی۔ میں نے ڈاکٹر اشپرنگر کی تالیف کے ذریعے سے اِس تذکرے سے کام لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب ''اُردو تذکروں کے

---

[۱] اِس کتاب خانے میں ایک قلمی نسخہ ''تذکرۂ شعرائے جہاں گیر شاہی'' کا بھی ہی جس کا مجھے علم نہ ہوا تھا۔ اِس میں صرف اُن فارسی شعرا کا ذکر ہی جو جہانگیر کے عہد میں تھے۔

انڈکس،، میں اِس سے بہت کچھ اقتباس کیا ہی۔ اصل قلمی نسخہ جے۔ بی۔ ایلیٹ کی ملک تھا، جس کی ضخامت پانسو صفحے کی تھی اور اُس میں ۳۱۴ شعرا کا مختصر ذکر تھا۔

۱۲۔ تذکرۂ نواب علی ابراہیم خاں، جس کا نام خود مؤلّف کے نام پر "گلزارِ ابراہیم" ہی اور اسی کے ساتھ حضرت ابراہیم کے قصّے کی تلمیح بھی ہی کہ وہ آگ جس میں نمرود نے اُنھیں ڈال دیا تھا گلزار سے بدل گئی تھی۔ یہ تذکرہ بھی فارسی میں ہی اور میں نے اپنی کتاب "ہندوستانی ادب کی تاریخ" میں اس سے بہت کام لیا ہی۔ مؤلّف نے اِسے ۱۱۹۶ھ (۸۲-۱۷۸۱) میں ختم کیا[۱] اِس میں تقریبًا تین سو اُردو شاعروں کا ذکر ہی اور ہر شاعر کے بیان کے ساتھ اُس کے کلام کا اِنتخاب بھی ہی۔ مؤلّف کے متعلق جو کچھ میں نے تاریخ ادب میں لکھا ہی، اُس پر اِس قدر اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اُن کا پورا نام نواب علی ابراہیم امین الدولہ ناصر جنگ تھا اور وہ پٹنے کے رہنے والے تھے۔ اُن کے دو تخلّص تھے ایک خلیلؔ اور دوسرا حالؔ[۲]۔ شورشؔ اور یوسف علی نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر پہلے تخلص سے کیا ہی، عشقیؔ نے دوسرے تخلص سے[۳]۔

---

[۱] [علی ابراہیم نے اپنے دیباچے میں اختتام کی تاریخ ۱۱۹۸ھ اور ۱۷۸۴ع لکھی ہی۔ (عبدالحق)]

[۲] [یہاں بھی مصنّف سے غلطی ہوئی ہی۔ اِن کا دوسرا تخلص "علی" تھا (عبدالحق)]

[۳] [علی ابراہیم خاں علاوہ ادیب ہونے کے مورّخ بھی تھے۔ "گلزار ابراہیم" کے علاوہ "خلاصۃ الکلام"، اور "صحفِ ابراہیم"، دو فارسی شعرا کے تذکرے بھی اُن کی تالیف سے ہیں۔ "وقائع جنگ مرہٹہ"، لارڈ کارنوالس کے عہد (۱۲۰۱ھ) میں لکھی جس کا ترجمہ میجر فلر نے انگریزی میں کیا۔ اِس میں پانی پت کی جنگ کا حال ہی۔ ایک کتاب میں راجہ چیت سنگھ والیٔ بنارس کی بغاوت کا حال ہی۔ لارڈ کارنوالس کے عہد میں بنارس میں چیف مجسٹریٹ اور بعد ازاں گورنر رہے۔ ۱۲۰۸ھ میں انتقال کیا۔ (عبدالحق)]

۱۳ - اٹھارھویں صدی کا آخری تذکرہ[۵۱] مصحفی کا ہی - یہ بھی فارسی میں ہی - سال تالیف ۱۲۰۹ھ (۹۵-۱۷۹۴ع) ہی - میں نے اِس مصنف کے متعلق جو کچھ اپنی کتاب تاریخ ادب میں لکھا ہی، اُس پر اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں: ایک تو یہ کہ فون ہامر کی رائے کے بموجب، جو اُنھوں نے میری کتاب کے تبصرے میں ظاہر فرمائی ہی، اُن کے نام کا تلفّظ (بہ فتحۂ میم) کرنا چاہیے جس کے معنی یہ ہیں کہ اُسے قرآن یعنی مُصحف سے نسبت ہی -

شیفتہ کا قول ہی: مؤلف دہلی میں پیدا ہوا تھا اور وہ ہندوستانی اور فارسی میں اپنے فن کا اُستاد تھا - شیفتہ سے اُن کی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی اور اُن سے دوستانہ تعلقات تھے - شیفتہ نیز کریم الدین کا بیان ہی کہ مصحفی نے ریختے کے چھے دیوان لکھے ہیں - بہر حال فرح بخش (لکھنؤ) کے دیوان ہائے مصحفی کے قلمی نسخے میں صرف چار دیوان ہیں اور یہ چاروں ہندوستانی زبان میں ہیں - مصحفی نے فارسی میں بھی کئی دیوان لکھے ہیں اور فارسی شعرا کا بھی ایک تذکرہ لکھا ہی[۵۲] - اِس کے علاوہ ایک شاہنامہ بھی لکھنا شروع کیا تھا جو ناتمام رہ گیا - اِس میں شاہ عالم کے عہد تک کے واقعات منظوم کیے ہیں -

مصحفی نے اپنا اُردو شعرا کا تذکرہ میر مستحسن خلیق کی فرمائش سے لکھا جس میں محمد شاہ کے عہد سے لے کر اپنے وقت تک کے شعرا کا حال درج کیا اور اُن کی

---

[۵۱] اِس کا نام "تذکرۂ ہندی" ہی - انجمن ترقی اُردو نے ۱۹۳۳ع میں اِس کو شائع کردیا ہی (چ)

[۵۲] اِس تذکرے کا نام "عقد ثریا" ہی جو ۱۱۹۹ھ میں تالیف ہوا ہی - ۱۹۳۴ع میں انجمن ترقی اُردو نے طبع کرکے شائع کیا ہی - مصحفی نے اُردو شاعروں کا ایک اور تذکرہ "ریاض الفصحا" ۱۲۲۱ھ اور ۱۲۳۶ھ کے درمیان لکھا ہی - اِس میں اکثر اُن شاعروں کا ذکر ہی جن کے نام تذکرۂ ہندی میں نہ تھے - چند شاعروں کا اِس میں مکرر ذکر کیا ہی - انجمن ترقی اُردو نے تذکرۂ ہندی اور عقد ثریا کے ساتھ اِس کو بھی شائع کردیا ہی (چ)

تعداد تقریباً ایک سو پچاس ہے۔ مؤلف نے خاص کر اپنے ہم عصروں کے حالات بیان کرنے میں عالی ظرفی کا اظہار کیا ہے۔

مصحفی نے بڑی عمر پائی تھی، کیوں کہ اُن کی وفات "گلشن بے خار" کے چھپنے سے دس سال قبل یعنی سنہ ۱۸۲۲ع کے قریب ہوئی، لیکن کریم الدین اُن کی وفات کا سال سنہ ۱۸۱۴ع بتاتے ہیں۔ اُن کی شہرت اُس دور کے آخر میں ہونی شروع ہوئی جس میں سودا، جرأت اور اِنشا کا دَور دَورہ تھا۔ وہ حاتم کے بھی ہم عصر رہے ہیں، جیسا کہ حاتم کے "دیوان زادہ" کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے۔ قائم جو دلّی کے مشاعروں میں موجود تھا[1] اُن کے بہت سے اشعار نقل کرتا ہے، سرور نے کوئی ۲۴ صفحوں میں اُن کے کلام کا انتخاب دیا ہے۔

۱۴۔ تذکرۂ لُطف (مرزا علی خاں)۔ یہ تذکرہ سب کا سب اِس صدی (انیسویں صدی) کے شروع میں لکھا گیا ہے، یعنی ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰-۰۱ع) میں۔ اِس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومیت کا خیال لوگوں میں ترقی کر رہا ہے، کیونکہ جہاں تک میرا علم ہے، یہ پہلا تذکرہ ہے جو بخلاف دوسرے تذکروں کے، جو اس سے قبل لکھے گئے ہیں، فارسی میں نہیں بلکہ اِسلامی ہندوستانی یعنی اُردو میں لکھا گیا ہے۔ اِس تذکرے میں جو "گلشنِ ہند" کے نام سے موسوم ہے، ۶۶ شاعروں[2] کا ذکر ہے، لیکن ہر ایک کے حال کے ساتھ کثرت سے اُس کے کلام کا انتخاب دیا ہے۔ مثلاً خود مؤلّف تذکرہ کے حالات کے بعد اُس کی غزلیات کا پورا دیوان درج ہے جو بہتر

---

[1] مصنف نے بالکل برعکس لکھ دیا ہے۔ قائم کے تذکرے میں مصحفی کا ذکر نہیں۔ مصحفی بعد کا شاعر ہے۔ مصحفی نے قائم کے کلام کا طویل انتخاب درج کیا ہے (چ!)

[2] حیدر آباد میں جو نسخہ مرتّب ہُوا تھا اور لاہور سے شائع ہُوا اُس میں ۶۹ شاعروں کا ذکر ہے (عبدالحق)

قلمی نسخے میں ۱۷ سطروں کے ۱۳۱ صفحوں پر ہے، اور اُس کے علاوہ ۱۷ صفحوں پر قصیدے اور ۲۵ صفحوں پر عشقیہ مثنویاں ہیں، سب ملا کے ۳۷۰ صفحے ہوتے ہیں

میں نے اپنی کتاب "تاریخ ادب ہندوستانی" میں لطف کے حالات لکھے ہیں، یہاں اِس قدر اور لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی میں پیدا ہؤا، پٹنے اور لکھنؤ میں رہا اور آخر میں حیدرآباد آگیا، جہاں وہ کمال سے ایک سال بعد پہنچا، کمال کو وہ لکھنؤ ہی سے جانتا تھا اور دکن میں اُس سے پھر ملاقات ہوئی۔ لطف، شعروسخن میں اپنے باپ کاظم بیگ خاں ہجری کا شاگرد تھا (جو خود بھی ہندوستانی میں شعر کہتا تھا) اور بقول شیفتہ اُسے میر سے بھی تلمذ حاصل تھا۔

۱۵ - "مجموعۂ انتخاب"۔ یہ کمال (فقیر شاہ محمد یا شاہ کمال الدین حسین[1]) کی تالیف ہے۔ یہ اُن تذکروں میں سے ہے جن کا علم مجھے رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے خاص اصحاب کی بدولت اُس وقت سے ہے جب کہ میں اپنی تاریخ ادب شائع کرنے والا تھا، نیز اُن تذکروں میں سے ہے جن سے صرف میں نے ہی استفادہ کیا ہے۔ افسوس ہے کہ جو نسخہ مجھے ہاتھ لگا، اگرچہ وہ بہت عمدہ نستعلیق خط میں لکھا ہؤا ہے، لیکن کاتب نے بڑی بے پروائی سے لکھا ہے اور یہی نہیں بلکہ بے سمجھے اُس میں تصرّف بھی کر دیا ہے۔ اِس قسم کی بے احتیاطی ایسی کتابوں میں جن کا تعلق انتخابات سے ہو، بہت ہی قابل افسوس ہوتا ہے۔

۱۶ - "مجموعۂ نغز"، یہ قاسم (سید ابوالقاسم[2]) معروف بہ قدرت اللہ قادری کی تالیف ہے۔ اِس تذکرے کی اِطلاع مجھے اُس وقت ہوئی جب کہ میری کتاب شائع ہو چکی تھی۔

---

[1] ["مجموعۂ انتخاب" کے دیباچے میں "شاہ محمد کمال" درج ہے۔ (چ)]

[2] قاسم لکھتا ہے کہ "ابوالقاسم" کا نام میں نے آنحضرت صلعم کی عقیدت میں اختیار کیا ہے۔

یہ کتاب قاسم نے ۱۲۲۱ھ (۷ - ۱۸۰۶ع) میں تالیف کی - اِس کا نام تاریخی ہے - یہ مقفّیٰ اور مسجّع فارسی نثر میں ہے - شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں شاعری پر بحث ہے - اس دیباچے کا طرزِ تحریر وہی ہے جو اصل کتاب کا ہے - لیکن دوسرے تذکروں سے اِس میں یہ بات خاص امتیاز کی ہے کہ مؤلف نے شعرا کے نام بے سوچے سمجھے نہیں لکھ دیے ہیں، بلکہ ہم نام شاعروں کو ایک جگہ لکھا ہے، ان کی تعداد بتادی ہے اور ترتیب وار اُن کا حال لکھا ہے - اِس تذکرے میں کئی سو شاعروں کا حال ہے، تاہم سرور اور ذکا کے تذکروں میں شعرا کی تعداد اِس سے کہیں زیادہ ہے - لیکن یہ تذکرہ اُن سے بڑھا ہوا ہے، اور جگہ جگہ قصّے، لطیفے اور انتخابات اِس سلیقے سے دیے ہیں کہ دوسری جگہ نظر نہیں آتے[1] -

قاسم خود بھی ہندوستانی زبان کا مشہور اور ممتاز شاعر ہے - اُسے صغرسن سے شعروسخن کا ذوق تھا اور اس فن کو اُس نے ہدایت سے حاصل کیا تھا - تذکرے کی تالیف کے وقت وہ آٹھ ہزار شعر لکھ چکا تھا جو اُس کے دیوان میں موجود تھے - علاوہ اِس کے ۱۶۰۰ شعر کی ایک مثنوی موسوم بہ "قصۂ معراج" ہے؛ اور ایک اور مثنوی بوستاں کی بحر میں ہے، مگر یہ معلوم نہیں کہ کس مضمون پر ہے - ایک تیسری مثنوی جس میں ۵۲۰۰ شعر ہیں، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی کرامتوں کے حال میں ہے - قاسم قادری تھے اور یہ مثنوی اُسی عقیدت کی بنا پر لکھی ہے -

قاسم کو طب کا بھی شوق تھا، مگر یہ معلوم نہیں ہوا کہ وہ طبابت کرتے تھے یا نہیں -

---

[1] "تذکرۂ مجموعۂ نغز" کو پروفیسر محمود شیرانی نے مرتب کیا ہے جو سلسلۂ نشریات کلیۂ پنجاب میں ۱۹۳۳ع میں شائع ہوچکا ہے (چ)

کمال، سرور، شیفتہ، کریم نے اپنے اپنے تذکروں میں اُس کے کلام اور اُس کے اتقا کی بہت تعریف کی ہے۔ کریم کے قول کے مطابق قاسم کا اِنتقال ۱۰۹ برس کی عمر میں ۱۸۸۰ء میں ہوُا۔

۱۷۔ "عمدۂ منتخبہ" جو سرور کی تالیف ہے غالباً[1] ۱۲۲۱ھ (۷ — ۱۸۰۶ء) میں لکھی گئی تھی۔ میں نے جب اپنی تاریخ لکھی تو مجھے اُس کا علم نہ تھا، مگر اُس کے بعد مجھے اُس کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوُا اور میں نے فرصت سے اُس کا مطالعہ کیا۔

میر محمد خاں سرور، مؤلف تذکرۂ ہذا، کا خطاب اعظم الدولہ تھا۔ والد کا نام نواب ابوالقاسم مظفر خاں بہادر تھا۔ وہ ساقی معروف بہ سامی اور موزوں اور تجمل کے شاگرد تھے۔ علاوہ اِس تذکرے کے وہ صاحب دیوان بھی تھے۔ یہ

---

[1] تذکرے میں یہ سال تالیف صحیح طور سے نہیں بتایا گیا۔ اِس کی تالیف کے متعلق ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۱۶ھ دونوں سنوں کے تاریخی مادّے موجود ہیں۔ ایک مادّے سے سنہ ۱۲۴۲ھ نکلتا ہے، یہ شاید اِختتام تالیف کا سال ہے یا شاید نسخے کی کتابت کا۔ ڈاکٹر اشپرنگر کا نوٹ یہ ہے کہ ۱۲۱۹ھ (۵ - ۱۸۰۴) کے بعد کا کوئی سنہ کتاب میں نہیں پایا جاتا، لہٰذا ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ یہ تذکرہ اُسی سنہ میں یا اُس کے بعد کے سنہ میں تالیف ہوُا۔

[عمدۂ منتخبہ، تاریخی نام ہے۔ اس سے ۱۲۱۶ھ نکلتا ہے۔ چنانچہ غالب علی خاں سید نے جو تاریخی قطعہ لکھا ہے اُس کا آخری شعر یہ ہے:-

لکھی تاریخ وہی نام بھی ہے اِس کا رکھا — 'عمدۂ منتخبہ' اِس کی دہیں سید نے

لیکن اِحسان، نصیر، عاشق، قاسم، سید رضی، فراق نے جو مادۂ تاریخ نکالے ہیں اُن سے ۱۲۱۹ھ اور ممنون کے تاریخی مادے سے ۱۲۱۵ھ نکلتے ہیں۔ میرا نسخہ نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ کا مکتوبہ ہے جس کو عاشق نے اعظم الدولہ مؤلف تذکرہ کے حکم سے لکھا تھا (عبدالحق)]

تذکرہ فارسی میں ہی اور اِس میں بہت سے شعرا کا ذکر ہی جن کی تعداد ہزار اور بارہ سو کے درمیان ہی۔ ترتیب حروفِ ابجد کے لحاظ سے ہی اور ہر شاعر کا مختلف قسم کا کلام مختصر بھی درج ہی۔ سرور اپنے ذکر میں بہت انکسار کرتا ہی اور اِس معذرت کے ساتھ مشہور شعرا کے کلام کے ساتھ اپنا کلام بھی پیش کرتا ہی کہ جہاں پھول ہی وہاں کانٹا بھی ہوتا ہی۔ یہ تذکرہ قاسم کے تذکرے کے بعد کا ہی[1] اگرچہ سال تالیف وہی ہی، مگر شیفتہ کے تذکرے سے پہلے لکھا گیا ہی اور شیفتہ نے اِس سے اُسی طرح اِستفادہ کیا ہی جس طرح سرور نے قاسم[2] کے تذکرے سے۔

کریم کا بیان ہی کہ "عمدۂ منتخبہ" دہلی میں بہت مشہور ہی، بڑی اِحتیاط سے لکھا ہی اور شیفتہ اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے اِس سے استفادہ کیا ہی۔

سرور کا انتقال ۱۲۵۰ھ (۳۵-۱۸۳۴ء) میں ہوا۔ اُس کا بیٹا محمد خاں باپ کے قدم بقدم چلا۔ شیفتہ نے اُس کا نام اپنے ہم عصر شاعروں میں شامل کیا ہی۔

۱۸۔ "طبقاتِ سخن"، کا کوئی نسخہ مجھے دستیاب نہیں ہوا[3]۔ اِس تذکرے کے مؤلف کا نام، جس کا شمار ہندوستانی زبان کے شعرا میں کیا جاتا ہی، شیخ

---

[1] سرور کا تذکرہ قاسم کی نظر سے گزر چکا ہی جیسا کہ مجموعۂ نغز میں خود قاسم نے لکھا ہی ایسی صورت میں قاسم کے تذکرے کو تقدم زمانی حاصل نہیں ہو سکتا (چ)

[2] مصنف نے برعکس لکھ دیا ہی، قاسم نے سرور کے تذکرے سے اِستفادہ کیا ہی، قاسم نے اپنے تذکرے میں دو تین جگہ اِس کا اعتراف بھی کیا ہی۔ سرور کا تذکرہ پہلے لکھا گیا ہی جیسا کہ اوپر کے دو حاشیوں سے ثابت ہی۔ قاسم نے سرور کے تذکرے کی تاریخ بھی کہی ہی (چ)۔

[3] یہاں جو کچھ لکھا گیا ہی وہ اشپرنگر کی فہرست سے ماخوذ ہی۔

غلام محی الدین قریشی، تخلص عشق ہے- مؤلف میرٹھ میں پیدا ہوا- اُس کے والد کا نام نعمت اللہ نعمی[1] ہے، یہ بھی شاعر تھے اور فارسی میں صاحب دیوان ہیں- عشق کا کلام فارسی ہی میں نہیں بلکہ عربی میں بھی ہے- فارسی میں اُس کے دو دیوان ہیں- پہلے دیوان میں اُس کا تخلص مبتلا اور دوسرے میں عشق ہے اور اسی نام سے زیادہ تر مشہور ہے-

یہ تذکرہ فارسی میں ہے اور نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۲۲ھ (۸-۱۸۰۷ء) نکلتا ہے- یہ تذکرہ دوسروں کی نقل نہیں - اِس کے دو حصے ہیں جن کا نام مؤلف نے طبقات رکھا ہے- پہلے طبقے میں ریختے کے سو شاعروں کا ذکر ہے اور دوسرے میں اسی قدر فارسی شاعروں کا -

۲۰ - "تذکرۂ جہاں" اُن چھے تذکروں میں سے ہے جن سے میں نے اپنی تاریخ میں کام لیا ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اُن چھے تذکروں میں سے ہے جو ہندوستانی میں لکھے گئے ہیں - اِس تالیف کا نام "دیوان جہاں" ہے جس میں مؤلف کے تخلص[2] کا اشارہ ہے- بعض اوقات 'جہاں' کا لفظ استعارے کے طور پر ہندوستان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے- جو کچھ میں پہلے اپنی تاریخ میں اِس کتاب کے متعلق جو ۱۲۱۷ھ (۱۸۱۲ء) کی تالیف ہے، نیز اِس کے مؤلف کے متعلق لکھ چکا ہوں اُس کا اعادہ کرنا نہیں چاہتا- مؤلف اگرچہ ہندو ہے جو اُس کے نام بینی نراین سے ظاہر ہے، مگر کتاب اُس نے مسلمانوں کی زبان میں لکھی ہے- نئی اطلاع مجھے بینی نراین "جہان" کے متعلق یہ ملی ہے کہ وہ قوم کا کائستھ تھا اور بقول بعض دہلی کا رہنے والا اور بقول بعض

---

[1] بقول ڈاکٹر اشپرنگر- لیکن "نعمی" بھی ہو سکتا ہے-

[2] ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست کتب کے بموجب -

لکھنؤ کا باشندہ تھا - اُس کے باپ کا نام سدرشت نراین اور دادا کا نام لکشمی نراین تھا -

"دیوان جہان" کو تذکرہ نہیں بلکہ مجموعۂ انتخابات کہنا چاہیے - اِس میں کوئی ایک سو پچاس شعرا کا تذکرہ ہے - انتخابات بہت اچھے اور مختصر ہیں مگر اقتباسات بہت طویل ہیں -

علاوہ اِس تذکرے کے "جہان" کی اور تالیفات بھی ہندوستانی زبان میں ہیں - ایک "چار گلشن" ہے، جس کی بنیاد فارسی شاعر ہلالی کے قصے "شاہ و گدا یا درویش" پر ہے - دوسری "قصہ جات" - اِس میں قصے کہانیاں ہیں - نظمیں جن کا نمونہ وہ اپنے تذکرے میں دے چکے ہیں - تیسری ایک کتاب "تنبیہ الغافلین" کا ترجمہ ہے - یہ ایک مذہبی کتاب ہے جو فارسی زبان میں مشہور مسلمان مصلح اور فرقۂ وہابی کے بانی سید احمد کی فرمائش پر تالیف ہوئی تھی - اِس کتاب کے اور بھی ترجمے ہندوستانی زبان میں ہیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "جہان" فرقۂ وہابی سے تعلق رکھتا تھا یا کم سے کم مسلمان ہو گیا تھا، کیوں کہ وہ اِس کتاب کے دیباچے میں اِس طرح لکھتا ہے جیسے سچ مچ کا مسلمان -

۲۱ - "عیار الشعرا"، یہ بھی ایک ہندو خوب چند "ذکا" نامی کا لکھا ہوا ہے اور فارسی میں ہے - سنہ تالیف ۱۲۴۷ھ (۳۲ - ۱۸۳۱ع) یا اغلباً ۱۲۰۸ھ (۹۴-۱۷۹۳) سے ۱۲۴۷ھ (۳۲ - ۱۸۳۱ع) تک سمجھنا چاہیے، اِس لیے کہ مؤلف کا بیان ہے کہ اُس نے اپنے استاد "میر نصیر الدین" نصیر عرف میر کلّو کی فرمائش پر تیرہ سال اِس کے لکھنے میں صرف کیے - "ذکا" نے سنہ ۱۸۴۶ع میں انتقال کیا - یہ سنہ ڈاکٹر اشپرنگر کو اُس کے پوتے کی زبانی معلوم ہوا -

یہ اُن تذکروں میں سے ہے جن کا علم مجھے بالواسطہ ہوا - یہ فارسی زبان میں ہے

تفوق حاصل رہا ہے، کیوں کہ وہ بہت باقاعدہ لکھی جاتی ہے - اور اسی لیے تمام تذکرے جن کا میں ذکر کروں گا اُردو شاعروں سے متعلق ہیں، دکنی شعرا کا ذکر محض ضمناً آجاتا ہے - میرے قول کی تصدیق میرؔ کے اُس بیان سے ہوتی ہے جو وہ نکات الشعرا کے دیباچے میں فرماتے ہیں :-

"اگرچہ ریختہ در دکن است، چوں از آنجا یک شاعرِ مربوط برنخاستہ،
لہذا شروع بنام آنہا نہ کردہ و طبعِ ناقص مصروف اینہم نیست کہ احوالِ اکثر
آنہا ملال اندوز گردد، مگر بعضے از آنہا نوشتہ خواہد شد"

ہندی شعرا کے خاص تذکرے ہیں جنھیں "کب مالا" کہتے ہیں، لیکن جس قدر میرے علم میں آئے ہیں وہ بہت ہی کم ہیں - مجھے ہندوستانی مصنّفین کے تقریباً ستّر تذکروں اور منتخبات وغیرہ کا علم ہے - یہ ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے، لیکن ہندوستان کی ادبی تاریخ میں ان سے کچھ کام نہیں لیا جاتا - اِس لیے میں اِن میں سے ہر ایک کتاب کا کچھ ذکر کروں گا۔[1]

مضمونِ زیرِ بحث کے لحاظ سے ہندی شعرا کے تذکروں کا ذکر سب سے اوّل ہونا چاہیے، اِس لیے کہ اِن میں جن شعرا کا ذکر ہے وہ مقابلتاً مقدّم ہیں -

۱- "بھگت مال" (بھگت مالا) درحقیقت وشنوی فرقے کے ایسے سادھوؤں کے تذکرے ہیں جو بھجنوں کے بھی مصنّف ہیں - ہندی دراصل ہندو مصلحین کی زبان ہے، شیو کے قدیم فرقے کے پیرو ہندی میں نہیں لکھتے، وہ سنسکرت ہی زبان کے شیدائی ہیں -

بھگت مال کے بہت سے اڈیشن ہیں، لیکن اُن کی بنیاد اُن نظموں پر ہے جو

---

[1] [اِس لکچر کو گارساں دتاسی نے بعد میں رسالے کی شکل میں علیحدہ شائع کیا - صفحہ ۶۸ سے ۱۰۰ تک جو مواد رسالے میں ہے وہ مصنّف نے بعد میں اضافہ کیا - (مترجم)]

"چوپائی" کہلاتی ہیں، اِس نام کی وجہ یہ ہی کہ اُن میں چھ مصرعے ہوتے ہیں اور ہر مصرعے میں آٹھ ماترا ہوتے ہیں جسے "اشٹپائی" کہتے ہیں، جن میں کا آخری مصرع نظم کے شروع میں دُہرایا جاتا ہی - یہ نظمیں ایک قسم کے بھجن یا ہندی کے مقبول مذہبی گیت ہیں جو ہندوی یا قدیم ہندی زبان میں وشنوی سادھوؤں کی تعریف میں ہوتے ہیں - یہ بھجن بہت مشہور ہیں اور نابھاجی کی بدولت ہم تک پہنچتے ہیں - نابھاجی خود سادھو منش آدمی تھے اور مادر زاد اندھے تھے - اُنھوں نے یہ بھگت مالا سنہ ۱۵۴۰ع میں لکھی - شاہ جہاں کے عہد میں (۱۶۲۸ع-۱۶۵۸ع) نرائن داس نے اِن نظموں میں کچھ اصلاح کی، پھر سنہ ۱۷۱۳ع میں کرشن داس نے اور اُس کے بعد پریا داس نے اِن میں کچھ اضافہ کیا - راگ ساگر نے جو زمانۂ حال کا مصنّف ہی اور جس نے "راگ کلپادرم" مرتب کی ہی (جس کا ذکر میں عنقریب کروں گا)، بھگت مال کا ایک جدید اڈیشن شائع کرنے کا اعلان کیا ہی، لیکن مجھے اِس کی اِطلاع نہیں کہ وہ اڈیشن شائع ہوا یا نہیں - اُردو میں بھی اِس کا ایک اڈیشن ہی لیکن مجھے اُس کا علم نہیں - غرض کہ اصل نظمیں مع اضافے کے بھگت مال کہلاتی ہیں - اِن میں سے ہر ایک سوانح عمری چوپائی سے شروع ہوتی ہی اور جو نظمیں کہ بطور شرح کے ہیں وہ ٹیکا کہلاتی ہیں -

میں اپنی کتاب "ہندوستانی ادب کی تاریخ" کی تالیف اور اشاعت کے وقت صرف کرشن داس کے اڈیشن سے اِستفادہ کرسکا - لیکن اب مجھے پریاداس کا قلمی نسخہ بھی دستیاب ہوگیا ہی جو یورپ میں نادر ہی - یہ پریاداس جس کے معنی محبوب یعنی کرشن کے غلام کے ہیں، بنگال کا رہنے والا تھا - اِس صوبے میں ہندو، علاوہ اپنے صوبے کی زبان بنگالی کے ہندی میں بھی لکھتے ہیں اور مسلمان مثل مسلمانان صوبجات شمال و مغربی، اُردو اِستعمال

کرتے ہیں۔ اِس شخص کا تعلق وشنویوں کے ایک خاص فرقے سے ہے جس کا بانی نتیانند تھا۔ بھگت مالا کی شرح، جس کا وہ مؤلف ہے[1]، کبت کی بحر میں ہے اور اُس کا صحیح نام "بھگت رس بودھنی" ہے، جس کے لفظی معنی "بھگتی کے رس کا علم" ہیں۔ پریا داس کے بیانات "درش تنت" کے نام سے مشہور ہیں اور بھگت مال "بھگت پر سُبنیے" کے نام سے۔ یہ شخص اِس تذکرے کے اڈیشن سے اُس قدر مشہور نہیں جس قدر بھگوت کی وجہ سے جس کا یہ مصنّف ہے[2]۔

۲۔ "بھگت چرتر" (بھگتوں کی تاریخ)۔ یہ بھی بھگت مالا ہی کی سی کتاب ہے۔ اِس کا مؤلف گھوا چھدن ہے۔ یہ چودھویں صدی کا ہندی شاعر ہے اور اِس کی تصنیف سے اور بھی چند کتابیں ہیں۔

۳۔ "راگ کلپادرم"، جس کے معنی راگ کا درختِ مراد یا شجرِ بہشت ہیں۔ یہ عام مقبول گیتوں کا بہت ضخیم مجموعہ ہے (تخمیناً ۱۸۰۰ صفحے)۔ اِسے سری کرشنانند ویاس دیو نے مرتب کیا ہے، جس کے صلے میں دہلی کے بادشاہ نے اُسے راگ ساگر کا خطاب عطا فرمایا، اور یہ خطاب اب اُس کا تخلّص ہو گیا ہے۔ راگ ساگر گوڑ برہمن ہے اور علاقۂ میواڑ میں دیوگڑھ کوٹ یا اودے پور کا رہنے والا ہے۔ جو اشعار اُس نے اِس مجموعے میں جمع کیے ہیں، اُن کی تعداد بارہ لاکھ پچیس ہزار ہے۔ یہ مجموعہ کلکتے میں ۱۸۴۳ء میں چھپنا شروع ہوا اور ۱۸۴۵ء میں ختم ہوا۔ جیسا کہ مؤلف نے کتاب کے دیباچے میں بیان کیا ہے اُس نے اِن گیتوں کے جمع کرنے کے لیے بائیس سال تک سفر کیا۔ اِس شخص کی بدولت بہت سی ایسی نظمیں محفوظ ہو گئیں جو اب تک نامعلوم تھیں

---

[1] دیکھو ایچ ایچ ولسن، "ایشیاٹک ری سرچز"، جلد ۱۶، صفحہ ۵۶۔

[2] "ہندوستانی ادب کی تاریخ"، جلد اول صفحہ ۴۰۵۔

حالانکہ اُن کے مصنّف مشہور و معروف شاعر تھے۔

"راگ کلپادرم" میں کئی فصلیں ہیں، جن میں بڑی بڑی سات ہیں۔ پہلی میں مختلف راگوں کی نظمیں ہیں جو ۱۶۴ صفحے کی ہے۔ دوسری میں صرف سور ساگر ہے اور وہ ۶۰۰ صفحے کی ہے۔ تیسری میں، جو ۴۴۳ صفحے کی ہے، مختلف ہندو مسلمانوں کے گیت ہیں۔ چوتھی ۱۷۶ صفحوں کی ہے، جس میں بہار اور ہولی کے گیت ہیں۔ چوتھی کے دو حصے ہیں ایک میں دُھرپد اور دوسرے میں خیال ہیں۔ پہلا حصّہ ۲۰۸ صفحے کا اور دوسرا ۱۵۶ کا۔ چھٹی فصل میں صرف غزلیں اور ریختے ہیں جو ۱۷۶ صفحے پر ہے۔ آخری فصل میں صرف ۲۸ صفحے ہیں اور اِس میں راجہ بھرتری اور گوپی چند کا کلام ہے۔ اگرچہ یہ کتاب، جیسا کہ اِس کی تفصیل سے ظاہر ہے، ایک قسم کا مجموعۂ انتخابات ہے، لیکن اِس میں تذکرے کی بھی حیثیت ہے، کیوں کہ جن شاعروں کا مقبول کلام اِس میں درج ہے اُن کے کچھ کچھ حالات بھی لکھے ہیں۔

۴۔ افسوس ہے کہ مجھے "سجان چرتر" کے متعلق زیادہ واقفیت نہیں۔ اِس میں دو سو سے زیادہ ہندی شاعروں کا حال ہے جو سودن گوی نے ۱۷۴۸ء میں لکھی۔

۵۔ "کوی چرتر"۔ یہ کتاب جناردھن نے مرہٹی میں لکھی ہے۔ اِس میں کئی ہندو شاعروں کے حالات ہیں۔

اب ہم اُن تالیفات کی طرف رجوع کرتے ہیں جو صحیح طور پر تذکروں کے نام سے موسوم ہیں اور جن کا تعلق خصوصیت کے ساتھ اِسلامی ہندوستانی سے ہے۔ یعنی اُس بولی سے جو اُردو کہلاتی ہے۔

یہ تذکرے جدید ہیں جہاں تک میرا علم ہے، سب سے پُرانا گزشتہ

صدی (اٹھارھویں صدی) کے وسط میں لکھا گیا ہی - ان میں سے آٹھ تو گزشتہ صدی کے ہیں اور اُنیس ہماری صدی (اُنیسویں صدی) کے - اِن اُنیس میں سے صرف سات ایسے ہیں جو ہندوستانی زبان میں لکھے گئے ہیں -

ذیل میں اُن تذکروں کا ذکر بہ ترتیب سنہ کیا جاتا ہی -

۶ - جہاں تک ہمیں علم ہی، سب سے پہلا اور سب سے پُرانا میر (محمد تقی) کا تذکرہ "نکات الشعرا" ہی - میر صاحب نہایت نامور شاعر اور مستند اُستاد ہیں - یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہی، اور اِس میں تقریبًا سو شاعروں کا ذکر ہی - یہ حالات مختصر مگر زوائد سے پاک ہیں اور ساتھ ہی ساتھ شعرا کے کلام پر تنقید بھی کی گئی ہی - میں نے اپنی کتاب ہندوستانی ادب کی تاریخ میں میرؔ کے متعلق جو کچھ لکھا ہی، اُس پر اِس قدر اور اِضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ "میر" اُن کا تخلص تھا، تمغاے سیادت نہ تھا - چنانچہ شورؔش نے لکھا ہی کہ وہ شیخ تھے، سیّد نہ تھے[۱] - وہ آرزو کے بھانجے اور آگرے کے رہنے والے تھے - لیکن باپ کی وفات کے بعد وہ اپنے ماموں کے پاس دہلی آگئے جن سے اُنھوں نے اصلاح بھی لی - ۱۱۹۶ھ (۸۲ - ۱۷۸۱ع) میں وہ لکھنؤ چلے گئے - نواب آصف الدولہ نے دو سو سے تین سو روپے تک اُن کی ماہانہ تنخواہ کردی - میر صاحب نے لکھنؤ ہی میں اِنتقال کیا اور تقریبًا سو سال کی عمر پائی -

کمالؔ، جس نے اپنا "مجموعۂ انتخاب" ۱۸۰۴ع میں مرتب کیا، لکھتا ہی کہ میر صاحب اسّی سال سے زیادہ عمر کے تھے - ناسخؔ نے اُن کی تاریخ وفات کہی ہی، جس سے سنہ ۱۲۲۵ھ (۱۱ - ۱۸۱۰ع) نکلتا ہی - اُسی سال اُن کا کلیات

---

[۱] [یہ صحیح نہیں - میر صاحب سیّد تھے، اُن کی خود نوشتہ سوانح عمری نے یہ مسئلہ صاف کردیا ہی - (عبدالحق)]

بھی طبع ہوا۔ بہرحال تذکروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی وفات لکھنؤ میں ۱۲۱۵ھ (۱۔ ۱۸۰۰ء) اور ۱۲۲۱ھ (۰۷۔ ۱۸۰۶ء) کے درمیان ہوئی۔

قاسم کا اعتراض میر کے تذکرے کے متعلق یہ ہے کہ اُس میں بہت کچھ کھینچ تان سے کام لیا ہے اور میر نے اپنے ہم عصروں کے کلام پر نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن صاحب "آثار الصنادید" کی رائے میر کے کلام کے متعلق یہ ہے:۔

"میر کی زبان ایسی صاف اور شستہ ہے اور اس کے شعروں میں ایسے اچھے محاورات بے تکلف بندھے ہیں کہ آج تک سب اس کی تعریف کرتے ہیں۔ سودا کی زبان بھی اگرچہ بہت خوب ہے اور مضامین کی تیزی میر پر غالب ہے مگر میر کی زبان کو اُس کی زبان نہیں پہنچتی"۔

میر نے اپنا تذکرہ مخلص کی وفات سے ایک سال قبل لکھا۔ مخلص کی وفات ۱۱۶۴ھ (۵۱۔۱۷۵۰ء) میں ہوئی۔ میر صاحب خود اپنے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ اُردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے۔ "نکات الشعرا" کی عبارت یہ ہے:۔

"پوشیدہ نماند کہ در فنِ ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اُردوئے معلّٰی شاہجہان آباد دہلی، کتابے تا حال تصنیف نہ شدہ کہ احوالِ شاعرانِ این فن بصفحۂ روزگار بماند"۔

غالباً یہ بیان نیک نیتی پر مبنی ہے مگر صحیح نہیں ہوسکتا، کیوں کہ یہ امر یقینی ہے کہ میر کے زمانے میں پہلے سے بھی اُردو شعرا کے تذکرے موجود تھے۔ چنانچہ فتح علی حسینی اپنے تذکرے کے دیباچے میں (جس کا سنہ تالیف وہی ہے جو میر کے تذکرے کا یعنی سنہ ۱۱۶۵ھ[1] مطابق ۵۱۔۱۷۵۰ء) لکھتا ہے کہ اُس نے یہ تذکرہ لکھنے کا

---

[1] گردیزی کے تذکرے کا سنہ تالیف ۱۱۶۶ھ ہے جیسا کہ خود اُس نے خاتمے پر لکھا ہے۔ انجمن

اِرادہ اِس لیے کیا کہ جن لوگوں نے اِس سے قبل شعراے ریختہ کے تذکرے لکھے ہیں، اُنھوں نے محض حسد سے اُن پر نکتہ چینیاں کی ہیں، جس سے میں نے اِحتراز کیا ہی اور انصاف کو مدنظر رکھا ہی۔ اگرچہ یہ طنزیہ جملہ میرؔ کے تذکرے پر صادق آتا ہی[۱]، تاہم وہ تذکروں کا ذکر جمع کے صیغے میں کرتا ہی اور اِس لیے اگر ہم یہ قیاس کریں تو بیجا نہ ہوگا کہ سنہ ۱۷۵۱ع میں متعدد تذکرے ہندوستانی شعرا کے موجود تھے۔ علاوہ اِس کے ہم کو عنقریب یہ معلوم ہوگا کہ قائمؔ، جس نے اپنا تذکرہ اِن دونوں تذکروں کے کئی سال بعد لکھا، اِس بات پر فخر کرتا ہی کہ ہندوستانی شعرا کا یہ پہلا تذکرہ ہی۔ غالبًا سرقے کے الزام سے بچنے کے لیے اُس نے یہ سخن سازی کی ہی۔ کمالؔ نے اپنا تذکرہ اکبر شاعر کی فرمائش سے سنہ ۱۸۰۴ع میں تالیف کیا (اکبر[۲] کی وفات عالم جوانی میں سنہ ۱۸۰۳ع میں ہوئی)۔ اِس تذکرے سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ اکبر نے کئی سال قبل چالیس ہندوستانی تذکرے بہم پہنچائے تھے[۳]۔ اِس بنا پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہی کہ اُن تذکروں میں، جن میں سے اب ہمیں صرف ایک چوتھائی کا علم ہی، بعض میرؔ کے تذکرے سے بھی قدیم تھے[۴]۔

ترقیٔ اُردو نے یہ تذکرہ شائع کیا ہی۔ (چ) [مصنّف نے خود ہی پچھلے صفحے پر مخلص کی وفات ۱۱۶۴ھ میں اور "نکات الشعرا" کی تالیف اس سے ایک سال پہلے بتائی ہی یعنی ۱۱۶۳ھ اِس لیے ۱۱۶۵ھ سراسر غلط ہی۔ ع۔ص]

[۱] گردیزی نے میر صاحب کے تذکرے کو اپنا نشانۂ اِعتراض بنایا ہی۔ ملاحظہ ہو مقدمۂ تذکرۂ ریختہ گویاں (چ)

[۲] دیکھو اکبر (اکبر علی خاں) کا بیان کمال کے تذکرے میں۔

[۳] اس کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اس نے انیس برس کی عمر سے یہ سامان جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔

[۴] [مصنف کو کمال کی عبارت کے سمجھنے میں کچھ مغالطہ ہُوا ہی۔ اوّل تو اُس نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ اُس نے یہ تذکرہ اکبر کی فرمائش سے لکھا۔ دوسرے کمال نے چالیس کے ساتھ "دواوین" کا لفظ لکھا ہی جسے مصنّف نے "تذکرے" خیال کیا۔ تیسرے یہ سامان خود مؤلف تذکرہ نے جمع کیا تھا نہ کہ اکبر نے۔ کمال کی اصل عبارت یہاں نقل کی جاتی ہی۔ یہ ذکر اکبر کے متعلق ہی "بعد ازآن قریب چہل دواوین اساتذۂ ریختہ گویان کہ ہمراہ فقیر بود از یک طرف سیر ہمہ دواوین ساختہ بعد ازآن خود شوق شعر گفتن آغاز نمودہ رجوع این معنی بہ فقیر آوردہ بعرصۂ چندیہ فیض کلام سخنوران کلام خود را بہ پایۂ اعتبار کشیدہ"۔ "رجوع این معنی بہ فقیر آوردہ" سے مطلب یہ ہی کہ "مجھ سے اصلاح لینے لگا"، اِس کا مطلب مصنف نے یہ سمجھا کہ تذکرہ لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔

(عبدالحق)]

میر کی ہندوستانی نظمیں بے شمار ہیں، جن میں سے اکثر اُن کے کُلّیات مطبوعۂ کلکتہ، ۱۸۱۰ع میں موجود ہیں۔ اِس کُلّیات میں صرف فارسی کی نظمیں، جن کی تعداد کچھ زیادہ نہیں، درج نہیں کی گئیں۔ البتہ چند عشقیہ مثنویاں جو اِس کلیات میں نہیں ہیں، "مجموعۂ مثنویات" میں پائی جاتی ہیں۔ یہ مجموعہ سنہ ۱۸۵۱ع میں کانپور میں مصطفیٰ خاں کے اہتمام سے شائع ہوا۔ اِس میں علاوہ میر کی مثنویوں کے صادق خاں کی مثنویاں بھی شریک ہیں۔ میر کو اُس کے اہلِ وطن عام طور پر ہندوستانی شعرا میں دوسرا بڑا شاعر خیال کرتے ہیں؛ بعض اُسے سودا کا ہم رتبہ سمجھتے ہیں اور بعض قطعی طور پر اُس کے کلام کو سودا کے کلام پر ترجیح دیتے ہیں۔

۷۔ قائم نے، جو ایک مشہور شاعر ہُوا ہی، ایک تذکرہ لکھا ہی۔ اس کا نام بھی "نکات الشعرا"[۱] ہی، جو علاوہ اِس کے "طبقات الشعرا" کے نام سے بھی معروف ہی، کیوں کہ اُس کی تقسیم تین طبقوں میں کی گئی ہی۔ یہ اُن تذکرہ نویسوں میں ہی جو سعدی شیرازی کو اُردو شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔

۸۔ تذکرۂ فتح علی حسینی گردیزی۔ یہ ہندوستانی مصنّف ہی۔ ذات کا شیخ اور صوفی مشرب یعنی مسلمان فلسفی ہی۔ اِس نے یہ تذکرہ دِلّی میں فارسی زبان میں لکھا۔ اِس میں میر کے تذکرے کی طرح کم و بیش سو شاعروں کا ذکر ہی اور ترتیب بھی حروف ابجد کے لحاظ سے ہی۔ حسینی خود اپنے تذکرے میں اپنے تذکرے کا سنہ تالیف جتا کر بتاتا ہی۔ وہ انجام کے ذکر میں لکھتا ہی کہ اِس شاعر نے ۱۱۵۹ھ (۴۷-۱۷۴۶ع) میں یعنی اِس تذکرے کی تالیف سے چھے سال پہلے انتقال کیا، اِس حساب سے تالیف کا سال ۱۱۶۵ھ (۵۱-۱۷۵۰ع) ہُوا۔ یہی سال میر کے تذکرے کی تالیف کا ہی[۲]۔

---

[۱] [قائم کا تذکرہ "مخزن نکات" ہی۔ مصنف نے ظاہرا بھولے سے یہاں "نکات الشعرا" لکھ دیا ہی۔ (پچ)]

[۲] [معلوم ہوتا ہی کہ مصنف کے پیش نظر گردیزی کے تذکرے کا کوئی ناقص نسخہ تھا۔ خاتمے پر گردیزی نے صاف طور سے سنہ تالیف ۱۱۶۶ھ درج کیا ہی یعنی اُس نے "نکات الشعرا" کی تالیف کے ایک سال بعد اپنا تذکرہ لکھا ہی۔ (پچ)]

حسینی ضرور "نکات الشعرا" سے واقف تھا۔ ایک وجہ تو وہی ہے جو میں پہلے لکھ چکا ہوں، دوسری بات یہ ہے کہ وہ اُس سے صریحاً نقل کرتا ہے۔ اُس کا دیباچہ پڑھتے ہی فوراً معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ "نکات الشعرا" سے نقل کر رہا ہے، کیوں کہ میر صاحب نے ریختے کے طرز تحریر پر جو رائے ظاہر کی ہے وہی اُس نے لفظ بلفظ نقل کردی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسینی سنہ ۱۸۰۶ء تک زندہ تھا، کیوں کہ قاسم نے اُس کا ذکر زندہ مصنّفین میں کیا ہے۔

۹۔ اِس کے بعد تذکرۂ "مخزن نکات"[1] ہے۔ اِس کے مؤلف شیخ محمد قائم الدین 'قائم' چاندپوری ہیں۔ سال تالیف ۱۱۶۸ھ (۵۵-۱۷۵۴ء) ہے۔ اِس تذکرے سے بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ تین طبقات میں منقسم ہے، یعنی قدیم، وسطی اور جدید شعرا کے حالات ہیں کل شاعر جن کے حالات اِس میں درج ہیں ایک سو دس ہیں۔ سب سے عجیب بات اس تذکرے میں یہ ہے کہ مصنّف (جیساکہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے) اِس بات کا مدعی ہے کہ سب سے پہلا وہی ہے جس نے اِس مضمون پر قلم اُٹھایا ہے، جس کے یہ معنی ہوئے کہ اِس سے پہلے جس قدر تذکرے لکھے گئے تھے اُن سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ یعنی نہ صرف اُن تذکروں سے جو میرؔ سے پہلے لکھے گئے بلکہ میر اور فتح علی کے تذکروں سے بھی۔ ہمیں اِس بیان کی صداقت پر شبہہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے، مگر اِس سے کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

---

[1] "مخزن نکات"، تاریخی نام ہے۔ اکرم (شاعر) نے اِس پر تاریخی قطعہ بھی لکھا ہے۔ میرے کتاب خانے میں تذکرۂ قائم کا ایک خلاصہ ہے اور سرورق کی تحریر کے بموجب اُس میں میرؔ کے تذکرے کا خلاصہ بھی شریک ہے جو قائم کے تذکرے کی بنیاد ہے، اگرچہ قائم کا یہ دعویٰ ہے کہ اُسے اِس سے قبل کے کسی تذکرے کا حال معلوم نہیں۔

ایک بات جو اس سے قبل کے تذکروں میں نہیں پائی جاتی، یہ ہی کہ سعدی شیرازی نے اپنی سیاحتِ دکن کے زمانے میں اُس خطے کی زبان میں اشعار لکھے اور اِس لیے اُنھیں ہندوستانی شعرا میں شمار کرنا چاہیے[1] - یہ واقعہ یقینی نہیں تو اغلب ضرور ہی - اِس بیان کی میر اور فتح علی نے تردید کی ہی، کیوں کہ اُنھوں نے یہ اشعار دکن کے ایک فرضی سعدی سے منسوب کیے ہیں[2] - کمال نے بھی اِس معاملے میں قائم کا تتبع کیا ہی، وہ اکثر اِس تذکرے سے استفادہ کرتا ہی جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا؛ شورش دوسری رائے کا قائل ہی، جس نے اپنا تذکرہ قائم کے تذکرے سے دس سال بعد لکھا - دوسرے تذکرہ نویسوں نے حقیقی یا فرضی سعدی کے متعلق کچھ نہیں لکھا - اِس بحث کی یہ صورت ہی، اِس مسئلے پر میں اِس سے پیشتر مفصل بحث کر چکا ہوں[3] -

شاعر کی حیثیت سے قائم اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں خیال کیا جاتا ہی - بقول کمال سوائے سودا کے جو ہندی مسلمانوں کا مقبول شاعر ہی، وہ سب سے بڑھا ہوا ہی - اِس قول کی تائید میں وہ اپنے تذکرے میں قائم کے دیوان سے اس کا بہت سا کلام نقل کرتا ہی، جس میں بیانیہ، ہجویہ اور دوسری قسم کی نظمیں ہیں جو قومی خصائص کے نقطۂ نظر سے بہت دلچسپ ہیں -

شیفتہ کی رائے میں قائم کی بہترین نظمیں اُس کے قطعے اور رباعیاں ہیں - باقی نظموں کے وہ اُس قدر مدّاح نہیں جس قدر کمال ہی - اُن کے خیال میں قائم کو سودا کا ہم رتبہ سمجھنا حماقت ہی - قائم اوائلِ عمر ہی میں دہلی چلا گیا تھا،

---

[1] اِس کی بحث ژورنال آسیاتیک، بابت ۱۸۴۳ع میں دیکھو -

[2] (سعدی کے متعلق اکثر تذکرہ نویسوں کو مغالطہ ہوا ہی - یہ نہ سعدی شیرازی ہیں اور نہ دکن کے باشندے، بلکہ شمالی ہند کے رہنے والے تھے جو اکبر کے عہد میں ہوئے ہیں - تاریخ وفات ۱۰۰۲ھ ہی (عبدالحق))

[3] دیکھو ژورنال آسیاتیک، بابت ۱۸۴۳ع -

جہاں وہ بادشاہ کے ہاں سلسلۂ ملازمت میں داخل ہوگیا - ۱۲۰۷ھ اور ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۳-۹۵) کے درمیان انتقال کرگیا -

۱۰- تذکرۂ ابوالحسن کا نام "مسرّت افزا" ہے، یہ فارسی میں ہے اور ۱۲۰۷ھ (۱۷۷۹ع) میں تالیف ہوُا- میں نے اپنی کتاب "ہندوستانی ادب کی تاریخ" میں اس امر پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ اِس تذکرے کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے میں اِس سے اِستفادہ نہ کرسکا - مجھے اِس کا علم سر ولیم اوزلے کی قلمی نسخوں کی فہرست سے ہوُا تھا، جن کے پاس اِس کا ایک نسخہ تھا۔ اب اُن کے قلمی نسخے اکسفورڈ لائبریری میں آگئے ہیں اور میرے دوست نتھے نیل بلانڈ نے اپنی عنایت سے اُسے پڑھ کر اُس کا خلاصہ اور اُس کے اقتباسات میرے پاس بھیج دیے ہیں - یہ اِس لیے اور بھی کار آمد ثابت ہوُا کہ ڈاکٹر اشپرنگر نے اِس کا ذکر اپنی فہرست میں نہیں کیا ہے-

اِس تذکرے کے مؤلف کا نام ابوالحسن امیرالدین احمد ہے، جو امراللہ الہ آبادی کے نام سے بھی مشہور ہیں - وہ اپنا وطن چھوڑ کر عظیم آباد میں جا بسے اور پھر کلکتے گئے - اُنھیں ہندوستانی شاعری سے ذوق تھا اور اِسی لیے اُنھوں نے بہ زمانۂ سفر ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ع) یہ تذکرہ لکھا اور لکھنؤ آکر اِس میں اضافہ کیا-

۱۱- تذکرۂ شورش بھی فارسی میں ہے، ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹-۸۰ع) میں تالیف ہوُا- اِس کا کوئی خاص نام نہیں - مؤلف کا نام غلام حسین ہے مگر عام طور پر میر بھینا کے عرف سے مشہور ہے - میں نے ڈاکٹر اشپرنگر کی تالیف کے ذریعے سے اِس تذکرے سے کام لیا - ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب "اُردو تذکروں کے

---

[۱] اِس کتاب خانے میں ایک قلمی نسخہ "تذکرۂ شعرائے جہاں گیر شاہی"، کا بھی ہے جس کا مجھے علم نہ ہوُا تھا- اِس میں صرف اُن فارسی شعرا کا ذکر ہے جو جہانگیر کے عہد میں تھے -

انڈکس» میں اِس سے بہت کچھ اقتباس کیا ہی - اصل قلمی نسخہ جے - بی - ایلیٹ کی ملک تھا، جس کی ضخامت پانسو صفحے کی تھی اور اُس میں ۳۱۴ شعرا کا مختصر ذکر تھا -

۱۲ - تذکرۂ نواب علی ابراہیم خاں، جس کا نام خود مؤلّف کے نام پر «گلزارِ ابراہیم» ہی اور اسی کے ساتھ حضرت ابراہیم کے قصّے کی تلمیح بھی ہی کہ وہ آگ جس میں نمرود نے اُنھیں ڈال دیا تھا گلزار سے بدل گئی تھی - یہ تذکرہ بھی فارسی میں ہی اور میں نے اپنی کتاب «ہندوستانی ادب کی تاریخ» میں اس سے بہت کام لیا ہی - مؤلّف نے اِسے ۱۱۹۶ھ (۸۲-۱۷۸۱) میں ختم کیا[۵۱] اِس میں تقریباً تین سو اُردو شاعروں کا ذکر ہی اور ہر شاعر کے بیان کے ساتھ اُس کے کلام کا اِنتخاب بھی ہی - مؤلّف کے متعلق جو کچھ میں نے تاریخ ادب میں لکھا ہی، اُس پر اِس قدر اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اُن کا پورا نام نواب علی ابراہیم امین الدولہ ناصر جنگ تھا اور وہ پٹنے کے رہنے والے تھے - اُن کے دو تخلّص تھے ایک خلیلؔ اور دوسرا حالؔ[۵۲] - شورشؔ اور یوسف علی نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر پہلے تخلّص سے کیا ہی، عشقیؔ نے دوسرے تخلّص سے[۵۳] -

---

[۵۱] [علی ابراہیم نے اپنے دیباچے میں اختتام کی تاریخ ۱۱۹۸ھ اور ۸۴-۱۷۸۳ع لکھی ہی - (عبدالحق)]

[۵۲] [یہاں بھی مصنّف سے غلطی ہوئی ہی - اِن کا دوسرا تخلّص «علی» تھا (عبدالحق)]

[۵۳] [علی ابراہیم خاں علاوہ ادیب ہونے کے مورّخ بھی تھے - «گلزارِ ابراہیم» کے علاوہ «خلاصۃ الکلام» اور «صحفِ ابراہیم» دو فارسی شعرا کے تذکرے بھی اُن کی تالیف سے ہیں - «وقائع جنگ مرہٹہ» لارڈ کارنوالس کے عہد (۱۲۰۱ھ) میں لکھی جس کا ترجمہ میجر فلر نے انگریزی میں کیا - اِس میں پانی پت کی جنگ کا حال ہی - ایک کتاب میں راجہ چیت سنگھ والیٔ بنارس کی بغاوت کا حال ہی - لارڈ کارنوالس کے عہد میں بنارس میں چیف مجسٹریٹ اور بعد ازاں گورنر رہے - ۱۲۰۸ھ میں انتقال کیا - (عبدالحق)]

۱۳- اٹھارھویں صدی کا آخری تذکرہ[۵۱] مصحفی کا ہی- یہ بھی فارسی میں ہی- سال تالیف ۱۲۰۹ھ (۹۵-۹۴-۱۷ء) ہی- میں نے اِس مصنّف کے متعلق جو کچھ اپنی کتاب تاریخ ادب میں لکھا ہی، اُس پر اِتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں: ایک تو یہ کہ فون ہامر کی رائے کے بموجب، جو اُنھوں نے میری کتاب کے تبصرے میں ظاہر فرمائی ہی، اُن کے نام کا تلفّظ (بہ فتحۂ میم) کرنا چاہیے جس کے معنی یہ ہیں کہ اُسے قرآن یعنی مُصحف سے نسبت ہی-

شیفتہ کا قول ہی: مؤلف دہلی میں پیدا ہوا تھا اور وہ ہندوستانی اور فارسی میں اپنے فن کا اُستاد تھا- شیفتہ سے اُن کی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی اور اُن سے دوستانہ تعلقات تھے- شیفتہ نیز کریم الدین کا بیان ہی کہ مصحفی نے ریختے کے چھے دیوان لکھے ہیں- بہرحال فرح بخش (لکھنؤ) کے دیوان ہائے مصحفی کے قلمی نسخے میں صرف چار دیوان ہیں اور یہ چاروں ہندوستانی زبان میں ہیں- مصحفی نے فارسی میں بھی کئی دیوان لکھے ہیں اور فارسی شعرا کا بھی ایک تذکرہ لکھا ہی[۵۲]- اِس کے علاوہ ایک شاہنامہ بھی لکھنا شروع کیا تھا جو ناتمام رہ گیا- اِس میں شاہ عالم کے عہد تک کے واقعات منظوم کیے ہیں-

مصحفی نے اپنا اُردو شعرا کا تذکرہ میر مستحسن خلیق کی فرمائش سے لکھا جس میں محمد شاہ کے عہد سے لے کر اپنے وقت تک کے شعرا کا حال درج کیا اور اُن کی

---

[۵۱] اِس کا نام "تذکرۂ ہندی" ہی- انجمن ترقی اُردو نے ۱۹۳۳ء میں اِس کو شائع کردیا ہی (چ)

[۵۲] اِس تذکرے کا نام "عقد ثریا" ہی جو ۱۱۹۹ھ میں تالیف ہوا ہی- ۱۹۳۴ء میں انجمن ترقی اُردو نے طبع کرکے شائع کیا ہی- مصحفی نے اُردو شاعروں کا ایک اور تذکرہ "ریاض الفصحا" ۱۲۲۱ھ اور ۱۲۳۶ کے درمیان لکھا ہی- اِس میں اکثر اُن شاعروں کا ذکر ہی جن کے نام تذکرۂ ہندی میں نہ تھے- چند شاعروں کا اِس میں مکرر ذکر کیا ہی- انجمن ترقی اُردو نے تذکرۂ ہندی اور عقد ثریا کے ساتھ اِس کو بھی شائع کردیا ہی (چ)

تعداد تقریباً ایک سو پچاس ہے۔ مؤلف نے خاص کر اپنے ہم عصروں کے حالات بیان کرنے میں عالی ظرفی کا اظہار کیا ہے۔

مصحفی نے بڑی عمر پائی تھی، کیوں کہ اُن کی وفات "گلشن بے خار" کے چھپنے سے دس سال قبل یعنی سنہ ۱۸۲۲ع کے قریب ہوئی، لیکن کریم الدین اُن کی وفات کا سال سنہ ۱۸۱۴ع بتاتے ہیں۔ اُن کی شہرت اُس دور کے آخر میں ہونی شروع ہوئی جس میں سودا، جرأت اور اِنشا کا دور دورہ تھا۔ وہ قائم کے بھی ہم عصر رہے ہیں، جیسا کہ قائم کے "دیوان زادہ" کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے۔ قائم جو دلّی کے مشاعروں میں موجود تھا[۱] اُن کے بہت سے اشعار نقل کرتا ہے، سرور نے کوئی ۷،۴ صفحوں میں اُن کے کلام کا انتخاب دیا ہے۔

۱۴۔ تذکرۂ لُطف (مرزا علی خاں)۔ یہ تذکرہ سب کا سب اِس صدی (انیسویں صدی) کے شروع میں لکھا گیا ہے، یعنی ۱۲۱۵ھ (۰۱-۱۸۰۰ع) میں۔ اِس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومیت کا خیال لوگوں میں ترقی کر رہا ہے، کیونکہ جہاں تک میرا علم ہے، یہ پہلا تذکرہ ہے جو بخلاف دوسرے تذکروں کے، جو اس سے قبل لکھے گئے ہیں، فارسی میں نہیں بلکہ اِسلامی ہندوستانی یعنی اُردو میں لکھا گیا ہے۔ اِس تذکرے میں جو "گلشنِ ہند" کے نام سے موسوم ہے، ۶۶ شاعروں[۲] کا ذکر ہے، لیکن ہر ایک کے حال کے ساتھ کثرت سے اُس کے کلام کا انتخاب دیا ہے۔ مثلاً خود مؤلّف تذکرہ کے حالات کے بعد اُس کی غزلیات کا پورا دیوان درج ہے جو جبیر

---

[۱] مصنف نے بالکل برعکس لکھ دیا ہے۔ قائم کے تذکرے میں مصحفی کا ذکر نہیں۔ مصحفی بعد کا شاعر ہے۔ مصحفی نے قائم کے کلام کا طویل انتخاب درج کیا ہے (چ!)

[۲] حیدرآباد میں جو نسخہ مرتّب ہُوا تھا اور لاہور سے شائع ہُوا اُس میں ۶۹ شاعروں کا ذکر ہے (عبدالحق)

قلمی نسخے میں ۱۷ سطروں کے ۱۳۱ صفحوں پر ہے، اور اُس کے علاوہ ۱۷ صفحوں پر قصیدے اور ۲۵ صفحوں پر عشقیہ مثنویاں ہیں، سب ملا کے ۱۷۳ صفحے ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی کتاب "تاریخ ادب ہندوستانی" میں لطف کے حالات لکھے ہیں، یہاں اِس قدر اور لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی میں پیدا ہوا، پٹنے اور لکھنؤ میں رہا اور آخر میں حیدرآباد آگیا، جہاں وہ کمال سے ایک سال بعد پہنچا، کمال کو وہ لکھنؤ ہی سے جانتا تھا اور دکن میں اُس سے پھر ملاقات ہوئی۔ لطف، شعر و سخن میں اپنے باپ کاظم بیگ خاں ہجری کا شاگرد تھا (جو خود بھی ہندوستانی میں شعر کہتا تھا) اور بقول شیفتہ اُسے میر سے بھی تلمذ حاصل تھا۔

۱۵ - "مجموعۂ انتخاب"۔ یہ کمال (فقیر شاہ محمد یا شاہ کمال الدین حسینی[۱]) کی تالیف ہے۔ یہ اُن تذکروں میں سے ہے جن کا علم مجھے رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے خاص اصحاب کی بدولت اُس وقت سے ہے جب کہ میں اپنی تاریخ ادب شائع کرنے والا تھا، نیز اُن تذکروں میں سے ہے جن سے صرف میں نے ہی استفادہ کیا ہے۔ افسوس ہے کہ جو نسخہ مجھے ہاتھ لگا، اگرچہ وہ بہت عمدہ نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے، لیکن کاتب نے بڑی بے پروائی سے لکھا ہے اور یہی نہیں بلکہ بے سمجھے اُس میں تصرّف بھی کردیا ہے۔ اِس قسم کی بے احتیاطی ایسی کتابوں میں جن کا تعلق انتخابات سے ہو، بہت ہی قابلِ افسوس ہوتا ہے۔

۱۶ - "مجموعۂ نغز" یہ قاسم (سید ابوالقاسم[۲]) معروف بہ قدرت اللہ قادری کی تالیف ہے۔ اِس تذکرے کی اِطلاع مجھے اُس وقت ہوئی جب کہ میری کتاب شائع ہو چکی تھی۔

---

[۱] ["مجموعۂ انتخاب" کے دیباچے میں "شاہ محمد کمال" درج ہے۔ (چ)]

[۲] قاسم لکھتا ہے کہ "ابوالقاسم" کا نام میں نے آنحضرت صلعم کی عقیدت میں اختیار کیا ہے۔

یہ کتاب قاسم نے ۱۲۲۱ھ (۷ - ۱۸۰۶ء) میں تالیف کی - اِس کا نام تاریخی ہی - یہ مقفّیٰ اور مسجّع فارسی نثر میں ہی - شروع میں ایک دیباچہ ہی جس میں شاعری پر بحث ہی - اِس دیباچے کا طرزِ تحریر وہی ہی جو اصل کتاب کا ہی - لیکن دوسرے تذکروں سے اِس میں یہ بات خاص امتیاز کی ہی کہ مؤلف نے شعرا کے نام بے سوچے سمجھے نہیں لکھ دیے ہیں، بلکہ ہم نام شاعروں کو ایک جگہ لکھا ہی، ان کی تعداد بتادی ہی اور ترتیب وار اُن کا حال لکھا ہی - اِس تذکرے میں کئی سو شاعروں کا حال ہی، تاہم سرور اور ذکا کے تذکروں میں شعرا کی تعداد اِس سے کہیں زیادہ ہی - لیکن یہ تذکرہ اُن سے بڑھا ہُوا ہی، اور جگہ جگہ قصّے، لطیفے اور انتخابات اِس سلیقے سے دیے ہیں کہ دوسری جگہ نظر نہیں آتے[1] -

قاسم خود بھی ہندوستانی زبان کا مشہور اور ممتاز شاعر ہی - اُسے صغرسن سے شعر و سخن کا ذوق تھا اور اِس فن کو اُس نے ہدایت سے حاصل کیا تھا - تذکرے کی تالیف کے وقت وہ آٹھ ہزار شعر لکھ چکا تھا جو اُس کے دیوان میں موجود تھے - علاوہ اِس کے ۱۶۰۰ شعر کی ایک مثنوی موسوم بہ ' قصۂ معراج ' ہی؛ اور ایک اور مثنوی بوستاں کی بحر میں ہی، مگر یہ معلوم نہیں کہ کس مضمون پر ہی - ایک تیسری مثنوی، جس میں ۵۲۰۰ شعر ہیں، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی کرامتوں کے حال میں ہی - قاسم قادری تھے اور یہ مثنوی اُسی عقیدت کی بنا پر لکھی ہی -

قاسم کو طب کا بھی شوق تھا، مگر یہ معلوم نہیں ہُوا کہ وہ طبابت کرتے تھے یا نہیں -

---

[1] "تذکرۂ مجموعۂ نغز" کو پروفیسر محمود شیرانی نے مرتب کیا ہی جو سلسلۂ نشریات کلیۂ پنجاب میں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوچکا ہی (پچ)

کمال، سرور، شیفتہ، کریم نے اپنے اپنے تذکروں میں اُس کے کلام اور اُس کے اتقا کی بہت تعریف کی ہی۔ کریم کے قول کے مطابق قاسم کا انتقال ۱۰۹ برس کی عمر میں ۱۸۰۰ع میں ہُوا۔

۱۷۔ "عمدۂ منتخبہ" جو سرور کی تالیف ہی غالباً ۱۲۲۱ھ [1] (۷ ـ ۱۸۰۶ع) میں لکھی گئی تھی۔ میں نے جب اپنی تاریخ لکھی تو مجھے اُس کا علم نہ تھا، مگر اُس کے بعد مجھے اُس کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہُوا اور میں نے فرصت سے اُس کا مطالعہ کیا۔

میر محمد خاں سرور، مؤلف تذکرۂ ہٰذا، کا خطاب اعظم الدولہ تھا۔ والد کا نام نواب ابوالقاسم مظفر خاں بہادر تھا۔ وہ ساقی معروف بہ سامی اور موزوں اور تجمل کے شاگرد تھے۔ علاوہ اِس تذکرے کے وہ صاحب دیوان بھی تھے۔ یہ

---

[1] تذکرے میں یہ سال تالیف صحیح طور سے نہیں بتایا گیا۔ اِس کی تالیف کے متعلق ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۱۶ھ دونوں سنوں کے تاریخی مادّے موجود ہیں۔ ایک مادّے سے سنہ ۱۲۴۲ھ نکلتا ہی، یہ شاید اختتام تالیف کا سال ہی یا شاید نسخے کی کتابت کا۔ ڈاکٹر اشپرنگر کا نوٹ یہ ہی کہ ۱۲۱۹ھ (۵ ـ ۱۸۰۴) کے بعد کا کوئی سنہ کتاب میں نہیں پایا جاتا، لہٰذا ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ یہ تذکرہ اُسی سنہ میں یا اُس کے بعد کے سنہ میں تالیف ہُوا۔

[عمدۂ منتخبہ، تاریخی نام ہی۔ اس سے ۱۲۱۶ھ نکلتا ہی۔ چنانچہ غالب علی خاں سید نے جو تاریخی قطعہ لکھا ہی اُس کا آخری شعر یہ ہی:-

'عمدۂ منتخبہ' اِس کی وہیں سید نے لکھی تاریخ وہی نام بھی ہی اِس کا رکھا

لیکن اِحسان، نصیر، عاشق، قاسم، سید رضی، فراق نے جو مادۂ تاریخ نکالے ہیں اُن سے ۱۲۱۹ھ اور ممنون کے تاریخی مادے سے ۱۲۱۵ھ نکلتے ہیں۔ میرا نسخہ نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ کا مکتوبہ ہی جس کو عاشق نے اعظم الدولہ مؤلف تذکرہ کے حکم سے لکھا تھا (عبدالحق)]

تذکرہ فارسی میں ہی اور اِس میں بہت سے شعرا کا ذکر ہی جن کی تعداد ہزار اور بارہ سو کے درمیان ہی۔ ترتیب حروفِ ابجد کے لحاظ سے ہی اور ہر شاعر کا مختلف قسم کا کلام مختصر بھی درج ہی۔ سرور اپنے ذکر میں بہت انکسار کرتا ہی اور اِس معذرت کے ساتھ مشہور شعرا کے کلام کے ساتھ اپنا کلام بھی پیش کرتا ہی کہ جہاں پھول ہی وہاں کانٹا بھی ہوتا ہی۔ یہ تذکرہ قاسم کے تذکرے کے بعد کا ہی[1] اگرچہ سال تالیف وہی ہی، مگر شیفتہ کے تذکرے سے پہلے لکھا گیا ہی اور شیفتہ نے اِس سے اُسی طرح اِستفادہ کیا ہی جس طرح سرور نے قاسم[2] کے تذکرے سے۔

کریم کا بیان ہی کہ "عمدۂ منتخبہ" دہلی میں بہت مشہور ہی، بڑی اِحتیاط سے لکھا ہی اور شیفتہ اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے اِس سے استفادہ کیا ہی۔

سرور کا انتقال ۱۲۵۰ھ (۳۵-۱۸۳۴ع) میں ہوا۔ اُس کا بیٹا محمد خاں باپ کے قدم بقدم چلا۔ شیفتہ نے اُس کا نام اپنے ہم عصر شاعروں میں شامل کیا ہی۔

۱۸۔ "طبقاتِ سخن" کا کوئی نسخہ مجھے دستیاب نہیں ہوا[3]۔ اِس تذکرے کے مؤلف کا نام، جس کا شمار ہندوستانی زبان کے شعرا میں کیا جاتا ہی، شیخ

---

[1] سرور کا تذکرہ قاسم کی نظر سے گزر چکا ہی جیسا کہ مجموعۂ نغز میں خود قاسم نے لکھا ہی ایسی صورت میں قاسم کے تذکرے کو تقدم زمانی حاصل نہیں ہوسکتا (چ)

[2] مصنف نے برعکس لکھ دیا ہی، قاسم نے سرور کے تذکرے سے اِستفادہ کیا ہی، قاسم نے اپنے تذکرے میں دو تین جگہ اِس کا اعتراف بھی کیا ہی۔ سرور کا تذکرہ پہلے لکھا گیا ہی جیسا کہ اوپر کے دو حاشیوں سے ثابت ہی۔ قاسم نے سرور کے تذکرے کی تاریخ بھی کہی ہی (چ)۔

[3] یہاں جو کچھ لکھا گیا ہی وہ اشپرنگر کی فہرست سے ماخوذ ہی۔

غلام محی الدین قریشی، تخلص عشق ہے۔ مؤلف میرٹھ میں پیدا ہوا۔ اُس کے والد کا نام نعمت اللہ نعمی[1] ہے، یہ بھی شاعر تھے اور فارسی میں صاحب دیوان ہیں۔ عشق کا کلام فارسی ہی میں نہیں بلکہ عربی میں بھی ہے۔ فارسی میں اُس کے دو دیوان ہیں۔ پہلے دیوان میں اُس کا تخلص مبتلا اور دوسرے میں عشق ہے اور اسی نام سے زیادہ تر مشہور ہے۔

یہ تذکرہ فارسی میں ہے اور نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۲۲ھ (۰۸-۱۸۰۷ء) نکلتا ہے۔ یہ تذکرہ دوسروں کی نقل نہیں۔ اس کے دو حصے ہیں جن کا نام مؤلف نے طبقات رکھا ہے۔ پہلے طبقے میں ریختے کے سو شاعروں کا ذکر ہے اور دوسرے میں اسی قدر فارسی شاعروں کا۔

۲۰۔ "تذکرۂ جہاں"، اُن چھے تذکروں میں سے ہے جن سے میں نے اپنی تاریخ میں کام لیا ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اُن چھے تذکروں میں سے ہے جو ہندوستانی میں لکھے گئے ہیں۔ اِس تالیف کا نام "دیوان جہاں" ہے جس میں مؤلف کے تخلص[2] کا اشارہ ہے۔ بعض اوقات 'جہاں' کا لفظ استعارے کے طور پر ہندوستان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جو کچھ میں پہلے اپنی تاریخ میں اِس کتاب کے متعلق جو ۱۲۱۷ھ (۱۸۱۲ء) کی تالیف ہے، نیز اِس کے مؤلف کے متعلق لکھ چکا ہوں اُس کا اعادہ کرنا نہیں چاہتا۔ مؤلف اگرچہ ہندو ہے جو اُس کے نام بینی نراین سے ظاہر ہے، مگر کتاب اُس نے مسلمانوں کی زبان میں لکھی ہے۔ نئی اِطلاع مجھے بینی نراین "جہان" کے متعلق یہ ملی ہے کہ وہ قوم کا کائستھ تھا اور بقول بعض دہلی کا رہنے والا اور بقول بعض

---

[1] بقول ڈاکٹر اشپرنگر۔ لیکن "نعمی" بھی ہو سکتا ہے۔

[2] ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست کتب کے بموجب۔

لکھنؤ کا باشندہ تھا۔ اُس کے باپ کا نام سدرشت نراین اور دادا کا نام لکشمی نراین تھا۔

"دیوان جہان" کو تذکرہ نہیں بلکہ مجموعۂ انتخابات کہنا چاہیے۔ اِس میں کوئی ایک سو پچاس شعرا کا تذکرہ ہے۔ انتخابات بہت اچھے اور مختصر ہیں مگر اقتباسات بہت طویل ہیں۔

علاوہ اِس تذکرے کے "جہان" کی اور تالیفات بھی ہندوستانی زبان میں ہیں۔ ایک "چار گلشن" ہے، جس کی بنیاد فارسی شاعر ہلالی کے قصے "شاہ و گدا یا درویش" پر ہے۔ دوسری "قصہ جات"۔ اِس میں قصے کہانیاں ہیں۔ نظمیں جن کا نمونہ وہ اپنے تذکرے میں دے چکے ہیں۔ تیسری ایک کتاب "تنبیہ الغافلین" کا ترجمہ ہے۔ یہ ایک مذہبی کتاب ہے جو فارسی زبان میں مشہور مسلمان مصلح اور فرقۂ وہابی کے بانی سید احمد کی فرمائش پر تالیف ہوئی تھی۔ اِس کتاب کے اور بھی ترجمے ہندوستانی زبان میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "جہان" فرقۂ وہابی سے تعلق رکھتا تھا یا کم سے کم مسلمان ہوگیا تھا، کیوں کہ وہ اِس کتاب کے دیباچے میں اِس طرح لکھتا ہے جیسے سچ مچ کا مسلمان۔

۲۱۔ "عیار الشعرا"، یہ بھی ایک ہندو خوب چند "ذکا" نامی کا لکھا ہوا ہے اور فارسی میں ہے۔ سنہ تالیف ۱۲۴۷ھ (۳۲-۱۸۳۱ء) یا اغلباً ۱۲۰۸ھ (۹۴-۱۷۹۳ء) سے ۱۲۴۷ھ (۳۲-۱۸۳۱ء) تک سمجھنا چاہیے، اِس لیے کہ مؤلف کا بیان ہے کہ اُس نے اپنے استاد "میر نصیر الدین" "نصیر" عرف میر کلّو کی فرمائش پر تیرہ سال اِس کے لکھنے میں صرف کیے۔ "ذکا" نے سنہ ۱۸۴۶ء میں انتقال کیا۔ یہ سنہ ڈاکٹر اشپرنگر کو اُس کے پوتے کی زبانی معلوم ہوا۔

یہ اُن تذکروں میں سے ہے جن کا علم مجھے بالواسطہ ہوا۔ یہ فارسی زبان میں ہے

اور اس میں تقریبًا پندرہ سو شاعروں کا ذکر ہے اور ساتھ ساتھ اُن کے کلام کا نمونہ بھی ہے۔ ڈاکٹر اشپرنگر کا قلمی نسخہ ایک ہزار صفحے کا ہے جس کے ہر صفحے میں پندرہ سطریں ہیں۔ اِس فاضل مستشرق کی رائے ہے کہ اِس تذکرے میں تنقید کا نام نہیں اور مکررات اور غلطیوں سے پُر ہے۔ تاہم اِس میں شبہ نہیں کہ اِس میں سے بہت کچھ مل سکتا ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اِس کا کوئی نسخہ یورپ میں نہیں۔

۲۲ "گلشن بے خار"، ۱۲۵۰ھ (۳۵ - ۱۸۳۴ع) میں تالیف ہوا اور دہلی میں ۱۸۴۵ع میں چھپا۔ یہ متعدد بار طبع ہوا لیکن مجھے سب سے پہلے اِس کا قلمی نسخہ مسٹر بوٹرو، پرنسپل دہلی کالج، کی بدولت ملا۔ یہ تذکرہ جو فارسی زبان میں ہے، اپنے وقت کے تمام تذکروں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اِس قسم کی جتنی کتابیں ہیں اُن سب میں یہ زیادہ صحیح ہے۔ قاسم کے تذکرے سے بھی زیادہ، جس سے مؤلف نے بہ نسبت کسی دوسرے تذکرے کے زیادہ استفادہ کیا ہے۔

اِس کے مؤلف نواب محمد مصطفیٰ خاں بہادر دہلوی، تخلص شیفتہ، بہت بڑے شخص اور ہندوستانی زبان کے ممتاز شاعر ہیں۔ اِن کے والد کا نام نواب مرتضیٰ خاں بہادر تھا۔ یہ دلّی کے مشہور شاعر مومن کے شاگرد تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیفتہ سے پہلے وہ حسرتی تخلص کرتے تھے[۱]۔

وہ تذکرے میں اپنا ذکر بہت اِنکسار سے کرتے ہیں اور اِس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی عمر گرامی کا اکثر حصّہ اِس میں رائگاں کیا۔ اپنے حالات کے ختم پر دس صفحے میں اپنے کلام کا اِنتخاب دیا ہے۔

---

[۱] [دیباچۂ "گلشن بے خار" میں خود مؤلف نے لکھا ہے کہ فارسی میں اُن کا تخلص حسرتی تھا اور اُردو میں شیفتہ (چ)]

اُن کے اُردو کلام کا پورا دیوان ہی اور اُس کے علاوہ ابن جوزی کی مولد محدث (مطبوعۂ لکھنؤ) کا ترجمہ ہندوستانی میں کیا ہی - اصل کتاب عربی میں ہی اور اس میں، از روے احادیث، آنحضرت (صلعم) کے نسب، ولادت اور تعلیم و تربیت کے حالات ہیں -

شیفتہ کے ہاں ۱۸۴۷ء تک (جس کے بعد اُنھوں نے شہر کی سکونت ترک کردی تھی) برابر مشاعرے ہوتے تھے - وہ ابھی تک زندہ ہیں- دھرم نراین نے دہلی کے اخبار قران السعدین میں اُن کی بہت تعریف لکھی ہی-

۲۳ - "گلشن بے خزاں"، باطن (حکیم سید غلام قطب الدین) کے تذکرے کا ترجمہ ہی اور کچھ بھی نہیں - وہ آگرے میں پیدا ہوئے - وہ اور اُن کے باپ دادا اُسی شہر میں طبابت کرتے تھے - اُن کا انتقال ۱۲۵۹ھ (۴۴ - ۱۸۴۳ء) میں ہوا - اُن کا خاندان یہاں عرب سرائے سے آیا جو دہلی سے پانچ میل کے فاصلے پر ہی-

۲۴ - "گلدستۂ نازنینان"، مشہور ہندوستانی شعرا کے کلام کا انتخاب ہی- یہ دہلی میں ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں طبع ہوا اور ہندوستان میں بہت مقبول رہا - اِس کا حجم ۳۵۰ صفحے کا ہی اور ہر صفحے میں ۲۰ سطریں ہیں - شروع میں شاہی خاندان کے تین شاعروں کا ذکر ہی (جو اُس وقت بقید حیات تھے)- اُس کے بعد شاعری پر کچھ بحث ہی، اور آخر میں ۳۹ مختلف شاعروں کا تذکرہ اور اُن کے کلام کے طول طویل انتخابات ہیں -

۲۵ - "تذکرۂ ناصر لکھنوی"- اِس کا ذکر محسن نے کیا ہی-

۲۶، ۲۷، ۲۸ - یہ تین تذکرے "گلستانِ سخن" کے نام سے موسوم ہیں - اور ان کے مصنف صابر، جوش اور مبتلا ہیں - اِن کا حال دیکھنا ہو تو میری تاریخ دیکھیے -

۲۹ - "اِنتخاب دواوینِ شعراے مشہورِ زبانِ اُردو کا"۔ اِس کے مؤلف امام بخش صہبائی دہلی کالج کے پروفیسر ہیں - یہ فارسی کے بہت بڑے اُستاد مانے جاتے ہیں -اِسے ہم محض اِنتخاب نہیں کہہ سکتے ، اِس لیے کہ انتخابات کے ساتھ شاعروں کے مختصر حالات بھی درج ہیں - یہ بھی ایک قسم کا تذکرہ ہے۔ یہ حالات اُردو زبان میں ہیں -

اِس تالیف میں ولی ، درد ، سودا ، میر ، جرأت ، حسن ، نصیر ، ممنون ، ناسخ ، مول چند ، ذوق اور مومن کے کلام کے انتخابات ہیں - یہ کتاب سنہ ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ع) میں لکھی گئی اور دہلی میں سنہ ۱۸۴۲[1] میں طبع ہوئی - کل ۲۷۳ صفحے ہیں اور ہر صفحے میں ۲۰ سطریں - شروع میں ۲۳ صفحے کا ایک مقدمہ ہے جس میں صہبائی نے ہندوستانی شاعری اور اُس زبان کی خاص خاص نظموں کی بحروں پر بحث کی ہے اور ساتھ ساتھ بہت اچھی مثالیں بھی ہیں - ایک کتاب جو دہلی میں "خلاصۂ دیوانہا" کے نام سے طبع ہوئی ہے ، وہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے -

صہبائی کی عمر تقریباً ساٹھ سال[2] کی ہے ، نظم اُنھوں نے بہت کم لکھی ہے ، لیکن علاوہ اُس کتاب کے جس کا ابھی ذکر ہوا ہے ، اُن کی اور بھی تالیفات ہیں - ایک تو فارسی کتاب "حدائق البلاغت" کا اُردو ترجمہ ہے ، ترجمہ کیا ، یوں کہنا چاہیے کہ اُنھوں نے اُس کتاب کے مطالب کو اُردو شاعری پر ڈھال لیا ہے -

---

[1] [اِس سنہ کے لکھنے میں کچھ غلطی ہو گئی ہے - منشی کریم الدین نے ۱۸۴۴ع سال طبع لکھا ہے - عبدالحق]

[2] کریم نے سنہ ۱۸۴۷ع میں اُن کی عمر ۴۰ بتائی تھی لیکن ڈاکٹر اشپرنگر جو اُن کو جانتے تھے یہ کہتے ہیں کہ وہ ۱۸۵۴ع میں ۶۰ کے تھے -

دوسری ”ہندوستانی صرف ونحو“، جو اُردو زبان میں لکھی ہی - تین رسالے معمے پر، ”الفاظِ مشکلہ“[۱]، اور اِس قسم کی دوسری کتابیں اُن کی تالیف سے ہیں[۲]-

۳۰ - ”صحف ابراہیم“- مصنف کا نام خلیل ہی اِس لیے اِس پر سے کتاب کا یہ نام رکھا ہی - اِس کا ایک فارسی تذکرہ بھی ہی[۳]-

۳۱ - ”سراپا سخن“- اِس کا مؤلف محسن لکھنوی ہی، یہ شخص ہندوستانی زبان کا شاعر بھی ہی - یہ تذکرہ سنہ ۱۸۵۲ع میں اختتام کو پہنچا اور سنہ ۱۸۶۱ع میں طبع ہوُا - حجم ۴۰۰ صفحے کا ہی اور حاشیہ بھی تمام تحریر سے بھرا ہوُا ہی - اِس میں سات سو سے زیادہ شعرا کا مختصر ذکر ہی - کلام کے انتخاب کی ترتیب گلشن نشاط کی طرح مصنفین کے ناموں کے لحاظ سے ہی[۴]-

۳۲ - ”طبقات الشعرا“ یا ”تذکرۂ شعرائے ہند“ بھی ہندوستانی شعرا کا تذکرہ ہی اور اُردو زبان میں ہی، دہلی میں سنہ ۱۸۴۸ع میں طبع ہوُا - حجم ۵۰۴ صفحے ہی - سرورق پر اُردو کے علاوہ انگریزی تحریر بھی ہی جس کی آخری سطریں یہ ہیں ”تذکرہ شعرائے ریختہ کا مسٹر ایف فیلن صاحب بہادر اور مولوی کریم الدین نے گارسند ٹیسی کی تاریخ سے ترجمہ کیا“- یہ درحقیقت میری تاریخ کی پہلی جلد سے

---

[۱] اِسے ٹیک چند کی کتاب کی شرح سمجھنا چاہیے - اُس کا نام بھی یہی ہی - صہبائی کی کتاب ۱۸۴۷ع میں طبع ہوئی -

[۲] ”گلستان سخن“ مؤلفۂ مرزا قادر بخش صابر میں صہبائی کی تالیفات کے کسی قدر تفصیلی حالات درج ہیں (چ)]

[۳] [مصنف کو ”صحف ابراہیم“، کے مصنف کے بارے میں دھوکا ہوُا ہی - اِس کا ذکر تذکرہ نشان ۱۲ کے تحت حاشیۂ صفحہ ۶۱ پر ملے گا (چ)]

[۴] [یہ تمام انتخاب سراپا کے متعلق ہی - عبدالحق]

حذف و اضافہ کے ساتھ تالیف کیا گیا ہی، جس سے اب ایک نئی کتاب ہو گئی ہی اور استناد کے لیے کار آمد ہی - اضافہ تقریبًا تمام کا تمام یا تو خاندان تیموری کے شاہزادوں کے حالات کا ہی جو اپنا وقت کاٹنے کے لیے اُردو شاعری کیا کرتے تھے یا دہلی کالج کے پروفیسروں کے حالات سے متعلق ہی - پروفیسروں کا ذکر دلچسپ ہی، ایک تو اس لیے کہ اہلِ علم و فضل کا ذکر ہی، دوسرے اِس وجہ سے کہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہی -

کریم کی دوسری ہندوستانی تالیفات کا ذکر اِس موقع پر موجب طوالت ہوگا - علاوہ تصنیفات کے اُن کی تالیف سے ترجمے بھی ہیں اور ایسی کتابیں بھی ہیں جو اُنھوں نے مرتب کی ہیں -

---

ایسے تذکروں کے تبصرے کے بعد جو اُردو میں تالیف کیے گئے ہیں، میں یہ مناسب خیال کرتا ہوں کہ اُردو منتخبات کا بھی ذکر کروں - اِن سے ہندوستانی شاعری کے متعلق بہت سی دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ایسے کلام کا علم ہوتا ہی جو دوسری جگہ نہیں ملتا - ایسی جو جو کتابیں جس ترتیب سے میرے علم میں آئی ہیں اُن کی کسی قدر کیفیت میں یہاں لکھتا ہوں :-

۳۳، ۳۴، ۳۵ - اوّل دو مجموعے جن کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ فاضل انگریزوں کی بدولت تحریر میں آئے جو اِس نظر سے بہت قابل قدر ہیں - پہلے مجموعے کا نام 'Selections from the Popular Poetry of the Hindus' (ہندوؤں کی مقبول شاعری کا انتخاب) ہی - یہ کرنل بروٹن مرحوم[۱] کا مرتب کیا ہوا ہی - اِس میں ۵۹ مشہور ہندی گیت ہیں اور ضمنًا بہت سے

---

[۱] ٹامس ڈیر بروٹن Thomas Duer Broughton بہت با اخلاق شخص تھے اور مجھے ذاتی طور پر اُن کی ملاقات کا شرف حاصل تھا - اُن کا انتقال لندن میں ۱۶ نومبر ۱۸۳۵ع کو ہوا -

مقبول شعرا کا بھی ذکر آگیا ہے - دوسرے مجموعے کی تالیف میں مشہور ہندوستانی مصنف تارنی چرن متر، بھی (جو متعدد کتابوں کا مصنف ہے[1]) شریک تھا- اُن تمام انتخابات میں جن کا میں ذکر کروں گا یہ بہت اہم ہے- اِس میں منجملہ اور انتخابات کے بیتال پچیسی، بھگت مال، کبیر کے ریختوں کے بعض حصے، تلسی داس کی رامائن کا ایک دوہرا، باغ و بہار کا ایک باب اور گل بکاؤلی، آرائش محفل، اُردو ہتوپدیش، جوان کی شکنتلا کے بھی انتخاب ہیں -علاوہ ان کے مختلف شاعروں کی ۳۴۸ چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں جن میں سے بہت سی ایسی ہیں جو عام طور پر مقبول ہو چکی ہیں -

۳۶ - "گلدستۂ نشاط"، جس سے میں نے اپنی تاریخ میں بہت کچھ استفادہ کیا ہے، ۱۲۵۲ھ (۳۷ - ۱۸۳۶ء) کی تالیف ہے اور اُسی سال کلکتے میں طبع ہوئی - یہ ہندوستانی اشعار اور نظموں کا اچھا خاصا مجموعہ ہے- یہ ایک قسم کی فصاحت و بلاغت کی مشق ہے جو ایسے شعرا کی مثالوں سے حاصل کی گئی ہے جو فارسی میں شعر کہتے تھے - مولف تحصیلداری کے عہدے پر ہے اور کلکتے میں رہتا ہے-

۳۷ - "مجموعۂ واسوخت"، مختلف شاعروں کے واسوختوں کا مجموعہ ہے- یہ ۶۸ صفحے کا رسالہ ہے، جس کے حاشیے سے بھی کام لیا گیا ہے - یہ کتاب ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۹ء) میں لکھنؤ میں طبع ہوئی -

---

[1] منجملہ دوسری کتابوں کے پرش پریکشا بھی اس کی تالیف سے ہے جس کا ذکر میں نے اپنی تاریخ کی پہلی جلد میں کیا ہے - تارنی سنہ ۱۸۴۳ء میں زندہ تھا اور کلکتہ سکول بک سوسائٹی کا سکریٹری تھا [کلیات میر، کی ترتیب و تصحیح میں بھی شریک تھا - ع - ص-]

ہندوستانی شعرا کے تذکروں کے بعد جن کا علم مجھے بالواسطہ یا بلا واسطہ ہُوا، میں اپنی فہرست مکمل کرنے کے لیے اس قسم کی اُن کتابوں کا بھی ذکر کرنا مناسب خیال کرتا ہوں جن کے نام اُن تذکروں میں پائے گئے ہیں جن سے میں نے مدد لی ہے۔ اُن کی تفصیل یہ ہے:۔

۳۸۔ "کوِی پرکاش"۔ اِس کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندی تذکرہ ہے۔

۳۹۔ "وارتا" یا "بارتا"۔ ولبھا جو ایک ہندو فرقے کا بانی ہے اور جس کے چیلوں کی تعداد ۸۴ ہے، یہ اُس کے قصّوں اور باتوں کا عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ ولبھا اور اُس کے بعض چیلے ہندو مذہبی گیتوں کے مصنف بھی ہیں[۵۱]۔

۴۰۔ دلہارام کی بے شمار[۵۲] نظمیں جو نامور اشخاص کے متعلق ہیں۔ ایک تو رام سنیہی فرقے کے متعلق دوسری عموماً ہندوؤں نیز مسلمانوں کے متعلق۔

۴۱۔ تذکرۂ حسن (میر غلام حسن)۔ سرور اور دوسرے مصنفین اسے شعرائے ریختہ[۵۳] کا بہت اچھّا تذکرہ بتاتے ہیں[۵۴]۔ حسن خود ہندوستانی کا بہت نامور شاعر ہے۔ وہ مشہور مثنوی "سحر البیان"، کا (جس میں بے نظیر اور بدر منیر کا قصہ ہے) اور مثنوی "گلزار ارم" کا مصنّف اور صاحبِ دیوان ہے۔ باوجود اِس کے کہ وہ اپنی بعض صوفیانہ نظموں میں اور خاص کر اپنی مناجات میں (جس کا متن[۵۵] اور ترجمہ[۵۶]

---

[۵۱] دیکھو میری تاریخ جلد ۱، ص ۵۱۸۔
[۵۲] کہتے ہیں کہ ان کی تعداد ۱۰۹۹۹ ہے۔ دیکھو میری تاریخ، جلد اول ص ۱۶۱۔
[۵۳] تاریخ ادب ہندوستانی جلد ا صفحہ ۲۰۰۔
[۵۴] [یہ تذکرہ انجمن ترقی اُردو کی جانب سے ۱۹۲۲ع میں شائع ہو چکا ہے۔ انجمن اِس کا دوسرا ایڈیشن از سرِ نو مرتب کر کے عنقریب شائع کرنے والی ہے۔ (مترجم)]
[۵۵] قصۂ کامروپ کے متن کے بعد۔
[۵۶] ولی کے کلام کے ترجمے کے نوٹ میں۔

ہیں نے اپنی کتاب میں دیا ہی) بہت اچھے اور پاکیزہ خیالات کا اظہار کرتا ہی، اس نے بعض فحش نظمیں بھی لکھی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ ایسی اوباشی میں پڑ گیا تھا جس کی نظیر عیسائی ممالک میں شاذ ملتی ہی[1]۔

۴۲۔ "تذکرۂ سودا" قاسم نے اپنے تذکرے میں سعدی کے حال کے ضمن میں اُردو کے نہایت نامور شاعر سودا کے تذکرے کا بھی حوالہ دیا ہی۔ لیکن مجھے اُس کا اب تک علم نہیں۔

۴۳۔ "گلزارِ مضامین" یہ کتاب جو ۱۱۹۹ھ (۸۵-۱۷۸۴ع) میں شائع ہوئی مشہور شاعر طپش کی چھوٹی نظموں کا مجموعہ ہی۔ تاہم اِس میں تذکرے کی بھی صورت ہی، کیوں کہ دیباچے میں مصنف نے اُردو شاعری اور شاعروں سے بحث کی ہی۔

۴۴۔ "گلدستۂ حیدری"، اِس کے مؤلف حیدر بخش حیدری ہیں۔ جو اس صدی کی ابتدا میں بہت بڑے مصنف گزرے ہیں۔ اِس گلدستے میں علاوہ قصوں اور لطیفوں کے ایک دیوان اور ہندوستانی شعرا کا ایک تذکرہ ہی[2]۔

۴۵۔ تذکرۂ میر محمد علی ترمذی۔ یہ شخص ہندوستانی زبان کا مؤلف ہی۔ اِس نے شاہ نامۂ فردوسی کا خلاصہ نثر میں کیا ہی[3]۔ اِس تذکرے کا ذکر "گلزارِ ابراہیم"

---

[1] نہ معلوم میر حسن کی کون سی نظمیں مصنف کی نظر سے گزریں کہ اُس نے یہ رائے قائم کرلی۔ محض بعض نظموں کی بنا پر یہ قیاس کرلینا غلط ہی (بچ!)

[2] "گلدستۂ حیدری" کے بعض نسخوں کے آخر میں یہ تذکرہ پایا جاتا ہی اور بعض میں نہیں۔ یہ حیدری کا تذکرۂ گلشنِ ہند ہی جو اُردو زبان میں ۱۲۱۵ھ میں لکھا گیا ہی۔ کنبھایت کے ایک خانگی کتاب خانے میں یہ تذکرہ ہماری نظر سے گزرا ہی۔ (بچ)

[3] دیکھو میری تاریخ ادب ہندوستانی جلد ۱، ص ۳۵۹۔

میں پایا جاتا ہے ۔ اِس کے سوا مجھے اِس تالیف کے متعلق کوئی علم نہیں ۔

۴۶ ۔ ایک کتاب "روضۃ الشعرا" بھی ہے ۔ اِس کے متعلق مجھے کوئی علم نہیں [۵۱] ۔

۴۷ ۔ "تذکرۂ اختر" ۔ واجد علی شاہ سابق بادشاہ اودھ کا تخلص "اختر" ہے ۔ وہ جب لکھنؤ میں تھے تو اپنی فرصت کے وقت ادبی ذوق میں مصروف رہتے تھے ۔ وہ بہت سی ہندوستانی کتابوں کے مؤلف ہیں ، جن میں سے بعض چھپ کر شائع ہو گئی ہیں ۔ اِن میں سے کئی میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں ۔ اِس تذکرے کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اِس میں پانچ ہزار فارسی اور ہندوستانی شاعروں کا ذکر ہے ، لیکن میں ذاتی طور پر اِس سے بالکل ناواقف ہوں ۔

۴۸ ۔ اُردو شعرا کا ایک مختصر سا تذکرہ آزردہ (صدرالدین) نے بھی لکھا ہے ۔ یہ اِسی زمانے کے شخص ہیں اور ہندوستانی زبان میں شعر کہتے ہیں انھیں عربی میں بھی شعر کہنے کا شوق تھا شیفتہ نے سودا کے حال میں اِس تذکرے کا ذکر کیا ہے ۔ ڈاکٹر اشپرنگر کی آزردہ سے ملاقات تھی مگر ڈاکٹر صاحب نے کبھی اُن سے اِس تذکرے کا ذکر نہیں سُنا ۔ آزردہ کی عمر اِس وقت ۷۰ برس کی ہے [۵۲] ۔ وہ مولوی اور مفتی ہیں اور خاں کا خطاب بھی رکھتے ہیں ۔

۴۹ ۔ "تذکرۂ عاشق" (مہدی علی) ۔ یہ بڑے پُرگو شاعر ہیں ۔ اِن کے تین دیوان ہیں ، اور علاوہ اُن کے منظوم "قصۂ خاور شاہ" [۵۳] اور بہت سی نظموں کے

---

[۵۱] مصنف کو دھوکا ہوا ہے یہ تذکرہ نہیں بلکہ محمد حسین کلیم کا قصیدہ ہے جس کے متعلق میر صاحب نے لکھا ہے "میاں محمد حسین کلیم ... قصیدۂ گفتہ مسمی بہ روضۃ الشعرا در و نام تمام شعرا را نقل کردہ" (چ)

[۵۲] شیفتہ نے لکھا ہے کہ اِن کی عمر تقریباً پچاس سال کی ہے ۔

[۵۳] میں نے غلطی سے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں اِسے ماہ لقا سے منسوب کر دیا ہے ۔

مصنّف ہیں۔ دہلی میں اِن کے ہاں مشاعرے ہؤا کرتے تھے، اور یہ تذکرہ بھی اُنھیں شعرا کے متعلق ہی۔ اِس میں وہی نظمیں ہیں جو اُن مشاعروں میں پڑھی جاتی تھیں۔

۵۰۔ تذکرۂ "سروِ آزاد"، کا ذکر ابوالحسن نے اپنی کتاب "مسرت افزا" میں کیا ہی جس سے یہ خیال ہوتا ہی کہ اِس میں اُردو شاعروں کا ذکر ہوگا۔ نے تھے نیل نے اِس کا ذکر فارسی شعرا[۱] کے تذکروں میں کیا ہی۔ دونوں باتیں ممکن ہیں، کیوں کہ یہ مسئلہ ایسے شاعروں کا ہوجائے گا جن کا کلام فارسی میں بھی ہی اور ہندوستانی میں بھی۔

آزاد خود ہندوستانی زبان کا بہت بڑا شاعر تھا۔ اوپر جو کچھ کہا گیا ہی اُس کا یقین مجھے اِس لیے ہوتا ہی کہ آزاد نے فارسی شعرا کا ایک اور تذکرہ لکھا ہی جو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہی۔ اُس کا نام 'خزانۂ عامرہ' ہی۔ اِس کے دیباچے میں وہ بیس دوسرے تذکروں کا حوالہ دیتا ہی جن سے میں نے استفادہ کیا ہی[۲]۔

دوسری وجہ یہ ہی کہ آزاد ایک اور رسالے کا بھی مصنف ہی جو "ہندوستان کی غزلوں"، پر ہی اور جس کا نام "رسالۂ غزلان ہند" ہی۔ یعنی یہ اُن نظموں پر ہی جو ہندوستان میں لکھی گئی ہیں۔ ممکن ہی کہ یہ تذکرہ بھی ہو اور مجموعہ انتخابات بھی۔ اور شاید یہ کتاب بھی "سروِ آزاد" ہی ہو اور اِس دوسرے نام سے مشہور ہوگئی ہو[۳]۔

---

[۱] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۴ ص ۱۷۰۔

[۲] دیکھو اِس کتاب پر ایم۔ این بلانڈ کا مضمون۔ جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۹ صفحہ ۱۵۰۔

[۳] [مؤلف کی اِطّلاع "سرو آزاد" اور "غزلان الہند" کے متعلق مبہم اور مشتبہ سی ہی۔ اصل یہ ہی کہ سرو آزاد، آزاد کی مشہور کتاب "ماثرالکرام" تاریخ بلگرام کا دوسرا حصہ ہی۔ اِس کتاب کی دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں فارسی شعرا کے حالات ہیں اور دوسری میں شعرائے ہندی کے۔ اِن ہندی گو شاعروں میں سے بعض ریختہ میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ فارسی شعرا کی تعداد ۱۴۳ ہی اور ہندی کے شعرا کی صرف ۸۔ "غزلان الہند" میں (جس کو مصنف

"سروِ آزاد" فارسی میں ہے اور اُس کا ترجمہ ہاپوڑ کے کائستھ موتی لال نے جو دہلی کالج کے ممتاز طالب علم تھے اُنیس برس کی عمر میں سنہ ۱۸۴۷ء میں ہندوستانی میں کیا۔ اُس کے دوسرے ہی سال موتی لال نے گلستاں کا ترجمہ کیا اور دلی کے اخبار "قران السعدین" کی اڈیٹری کرنے لگا۔

افسوس نے اپنی کتاب "آرائشِ محفل" میں آزاد کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے۔

"میر غلام علی" آزاد بھی شعر و سخن و علم و فضل میں اپنے معاصرین کے بیچ لاثانی تھا، بلکہ اشعارِ عربی تو اِس فصاحت و بلاغت و بہتایت کے ساتھ کہ اہلِ ہند میں کسی نے اُس سے آگے بھی نہیں کہے۔ قصائد اُس کے اِس بات پر دال ہیں اور اُس کی تعریف میں فصیحانِ عرب کی زبانیں لال۔ پیدائش اُس کی گیارہ سے چودہ ہجری میں اور وفات اُس کی سن بارہ سے دو میں[۵۰]"۔

۵۱۔ "تذکرۂ کاملین"۔ یہ اِس زمانے کے ایک ہندوستانی زبان کے مصنف رام چندر کی تالیف ہے۔ یہ اور بھی بہت سی کتابوں کے مؤلف ہیں۔ یہ تذکرہ، جو دہلی میں ۱۸۴۹ء میں طبع ہوا، صرف شعرا ہی کے لیے مخصوص نہیں بلکہ اِس میں دوسرے اشخاص کا بھی ذکر ہے، اِسی لیے میں نے اِس کا یہاں ذکر کیا ہے۔

۵۲۔ "تذکرۂ ہندی" تالیفِ مولانا قدرت اللہ شوق۔ اِس تذکرے کا، جو "طبقات الشعرا" کے نام سے بھی موسوم ہے، مصحفی، سرور اور کریم نے ذکر کیا ہے؛ لیکن میرے دیکھنے میں نہیں آیا[۵۲]۔ اِس کا مؤلف بہت پُرگو شاعر ہے اور ایک لاکھ

غزلان ہند لکھتا ہے) ہندوستان کی فارسی شاعری کے صنائع وغیرہ پر بحث ہے نیز ہندوستانی عورتوں کے رسم و رواج اور اسرار، ہندی محبت اور اِسی قسم کے معاملات پر بحث کی گئی ہے عبدالحق]

[۵۰] آزاد کی ولادت اور وفات کے سنہ کے بارے میں افسوس کی اطلاع صحیح نہیں۔ ۱۱۱۶ھ اُن کی پیدائش کا سال ہے اور ۱۲۰۰ھ وفات کا (پ ح)]

[۵۲] [انجمن ترقیٔ اُردو نے اِس کو مرتب کر لیا ہے، عنقریب شائع ہو جائے گا (پ ح)]

شعر کہہ چکا ہی۔ قائم چاندپوری کا شاگرد ہی۔ اِس کے گھر میں اکثر مشاعرے ہوتے تھے اور ۱۸۰۷ع میں جب قاسم نے اپنا تذکرہ لکھا تو وہ بقید حیات تھا۔

۵۳۔ "تذکرۂ خاکسار"۔ اِس کے مؤلف میر محمد یار عرف کلن، کلو یا گلو[1] ایک متقی درویش اور مشہور شاعر تھے اور ۱۸۰۵ع میں انتقال کر گئے۔ اِس تذکرے کا حوالہ شورش نے دیا ہی۔ سرور جو خاکسار سے واقف تھا اِس کا ذکر نہیں کرتا، شاید اِس لیے کہ اِس کا تعلق فارسی شعرا سے ہی! لیکن میرے پاس اِس امر کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں[2]۔

۵۴۔ "تذکرۂ محمود" (سید حافظ محمود خاں) اِس تذکرے میں فارسی اور ہندوستانی دونوں کے شاعروں کا ذکر ہی۔ مؤلف جو اِسی زمانے کا ہی اور نسلاً افغان ہی، قرآن کا حافظ ہی جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہی۔ وہ ہندوستانی زبان میں شعر کہتا ہی؛ چنانچہ سرور نے اپنے تذکرے میں اُس کے اشعار کا انتخاب سات صفحوں میں کیا ہی۔

۵۵۔ "تذکرۂ مضمون" (امام الدین خاں) یہ مؤلف، جسے عشقی نے مظلوم لکھا ہی[3] اور جو محمد شاہ کے عہد میں ایک معزز خدمت پر تھا، اُسی تذکرہ نویس (عشقی) کے قول کے مطابق شعراے ریختہ کے ایک تذکرے کا مؤلف ہی[4]۔

---

[1] میر صاحب نے کلو لکھا ہی اور محمد معشوق کنبوہ کا یہ مصرع اُس کی شان میں نقل کیا ہی:-

کتا ہی دریار کا کلو اُس کا نام

[2] [یہ اُردو شاعروں کا تذکرہ تھا اور نکات الشعراء کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ مؤلف نے اِس کا نام "معشوق چہل سالۂ خود" رکھا تھا، اپنا حال تمام شاعروں سے اوّل لکھا تھا اور اپنا خطاب سید الشعرا قرار دیا تھا۔ ملاحظہ ہو نکات الشعرا ذکرِ خاکسار چ]۔

[3] دیکھو فہرست اشپرنگر صفحہ ۲۷۵۔

[4] [میر حسن نے لکھا ہی کہ یہ عہد محمد شاہی میں "سرچوکی رسالۂ والا شاہی"، تھا اور اُس نے اپنے معاصرین کا ایک مختصر تذکرہ لکھا تھا چ]۔

۵۶ - ''تذکرۂ ذوق'' (شیخ محمد ابراہیم) دہلوی، جو بادشاہ دہلی کے اُستاد تھے اور عمدۃ الاستادین اور ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز تھے - مرحوم بوٹروس کے پاس اِس کا ایک نسخہ دہلی میں تھا، وہ ضرور بڑی خوبی سے لکھا گیا ہوگا، کیوں کہ تذکرہ نویسوں نے ذوق کی بڑی تعریف کی ہی اور اُسے زندہ شعرا میں بہت نامور شاعر خیال کرتے ہیں اور اُسے ''طوطیٔ شکر مقال'' کہتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ اُس کا اعلیٰ تخیل گل و لالہ کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہی اور اُس کے خیال کا شعلہ دل کو پروانے کی طرح جلا کے خاک کر دیتا ہی -

۵۷ - ''تذکرۂ جہاں دار'' (مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ) - مرزا جواں بخت شاہ عالم ثانی کے بیٹے تھے - اِس شاہزادے نے، جو اُردو شاعری کا بہت بڑا مربّی تھا، خود بھی اُردو روزمرہ کی زبان میں قابل قدر شعر لکھے ہیں - مصحفی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ شاہزادے نے ہندوستانی شعرا کا تذکرہ جس میں اُن کے اِنتخابات بھی ہیں، مرتّب کیا ہی، جو افسوس ہی کہ اُن کی وفات کے وقت ۱۲۰۱ھ (۸۷ - ۱۸۸۶ع) میں مسودے کی حالت میں تھا اور جو نہ معلوم کس طرح امام بخش کشمیری[۵۱] کے ہاتھ پڑ گیا - اُس نے اپنے تذکرے میں اِس سے بے دھڑک کام لیا ہی[۵۲]

۵۸ - ''تذکرۂ امام بخش کشمیری'' - اِس کا ذکر میں نے سوائے مصحفی کے تذکرے کے اور کہیں نہیں دیکھا اور مصحفی نے مؤلف اور اُس کی تالیف کے متعلق کوئی خاص واقعات نہیں بتائے - مصحفی کو یہ شکایت ہی کہ امام بخش نے

---

۵۱ اِس نام سے التباس پیدا ہوتا ہی - یہ اور شخص ہی اور امام بخش صہبائی مؤلف ''انتخاب دواوین'' بالکل دوسرے شخص ہیں -

۵۲ تاریخ ادب ہندوستانی جلد ۱ صفحہ ۲۵۹ -

نہ صرف جہاندار شاہ کا سرقہ کیا بلکہ خود اُن کے تذکرے پر بھی ہاتھ صاف کیا ہی۔
یہ واقعہ مصحفی کو حقیقت سے معلوم ہُوا ۔ حقیقت کو جرأت نے امام بخش کی درخواست
پر اُس کی تالیف میں مدد دینے کے لیے آمادہ کیا تھا ۔ امام بخش نے حقیقت
سے اپنی کتاب نقل کرائی ۔ حقیقت کا بیان ہی کہ اُس کا کچھ حصّہ مصحفی کے تذکرے
سے نقل کیا گیا ہی ۔ اِس واقعے کی بنا پر مصحفی نے اُس کے متعلق ایک قطعہ لکھا ہی[1]
جس کا ترجمہ میں نے اپنی تاریخ کی پہلی جلد صفحہ ۲۱۷ میں دیا ہی۔

۵۹ ۔ "تذکرۃ النسائ" یہ خاص شاعر عورتوں کا تذکرہ ہی ، "ایشیا"
اور افریقہ دونوں مقام کی عورتوں کا[2]" اِس کے مولف کریم الدین مصنف طبقات
ہیں ۔ یہ تذکرہ دہلی میں چند سال قبل مرتّب ہو رہا تھا معلوم نہیں کہ اختتام
کو بھی پہنچا یا نہیں اور شائع ہُوا یا نہیں ۔

۶۰ ۔ "مختصر احوال مصنفان ہندی کے تذکروں کا" ۔ اِس کا دوسرا نام "رسالہ
"درباب تذکروں کے" ہی ۔ مؤلف اِس کے ذکاء اللہ دہلوی ہیں ۔ یہ رسالۂ ہذا کے
پہلے اڈیشن کا محض ترجمہ ہی اور کچھ بھی نہیں ۔

۶۱ ، ۶۲ ، ۶۳ ۔ میں اب صرف نام گنوا دیتا ہوں ۔ "تذکرۃ الحکما"
اور "تذکرۃ المفسرین" ۔ اِن دونوں کے مؤلف مولانا سبحان بخش ہیں جو اِس
زمانے کے فرزانہ اور ظریف ہندوستانی مصنف ہیں ۔ اور "تذکرۃ المشاہیر"[3]

---
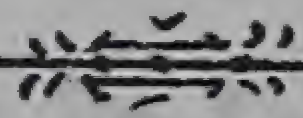
[1] اصل قطعہ یہ ہی :-
جانتے ہیں سب کہ مدّت سے یہاں　　مصحفی کے تذکرے کا شور ہی
تذکرہ یہ جو حقیقت نے لکھا　　بے حقیقت مصحفی کا چور ہی (چ)

[2] [خود مؤلف نے لکھا ہی کہ اِس میں صرف شاعر عورتوں کا ذکر نہیں بلکہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کی ان نامور عورتوں کا تذکرہ ہی جنھوں نے کسی فن میں ناموری حاصل کی ہی یا جنھوں نے مستقل حکمرانی کی ہی ۔ (چ)]

[3] تین حصوں میں ۔ دیکھو آگرہ گزٹ ، یکم جون ۱۸۵۵ع ۔

اِن تذکروں کے ذکر کے ساتھ میں اُن انتخابات کا بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں جن کے متعلق مجھے تذکروں سے معلومات حاصل ہوئی ہے - اور جس ترتیب سے میں نے تذکروں کا بیان لکھا ہے وہی ترتیب میں اِن کے متعلق بھی اختیار کرتا ہوں -

۶۴- "سبھا ولاس" یہ ہندی نظموں کا اِنتخاب پنڈت دھرم نرائن نے کیا ہے، جن کا تخلص ضمیر ہے - یہ شخص جو ۱۸۴۹ء میں صرف ۲۳، ۲۴ برس کا تھا، باوجود نوجوان ہونے کے اندور کا ڈائرکٹر تھا - وہ ہندی اُردو اخبار "مالوہ اخبار" بھی شائع کرتا تھا - اُس کے بعد سے اُس نے بہت سی کتابیں ہندوستانی میں شائع کی ہیں، جن میں سے اکثر انگریزی کا ترجمہ ہیں -

۶۵- "نورتن"[1] اِس نام میں اِشارہ ہے ایک زیور کا جو اِس نام سے مشہور ہے - نیز دنیا کے نو کھنڈ کا، اور بکرماجیت کے دربار کے نو بڑے شاعروں کا، جو نورتن کہلاتے ہیں - یہ ہندوستانی زبان کا اِنتخاب ہے جو محمد بخش نے مرتب کیا ہے - یہ کتاب دو مرتبہ بنارس میں چھپ چکی ہے - ایک بار ۱۸۴۵ء میں اور دوسری بار ۱۸۴۹ء میں -

۶۶- "کوی سنگرھا" یہ برج بھاشا نظموں کا مجموعہ ہے - اِسے ہیراچند نے، جو کئی اچھی کتابوں کا مؤلف ہے، بمبئی سے شائع کیا -

۶۷- "کبی بچن سدھا - یہ ہندی انتخاب ہے جو ہر مہینے کلکتے سے شائع ہوتا ہے[2] -

---

[1] [یہ انتخاب نہیں بلکہ اِس میں نو مختلف طبقوں (بادشاہوں، شاعروں، بخیلوں، افیونیوں، احمقوں وغیرہ) کے لطیفے اور نقلیں ہیں اور اسی وجہ سے اِس کا نام نورتن ہے - عبدالحق]

[2] میل اکجر بابت ۱۸۶۷ء صفحہ ۲۶ -

۶۸۔ "انتخابِ مشتاق"۔ یہ اِنتخاب حافظ تاج الدین "مشتاق" ساکن پٹنہ نے ۱۲۲۲ھ (۰۷-۱۸۰۶ع) میں مرتب کیا۔ میں ذاتی طور پر اِس انتخاب سے واقف نہیں، لیکن سرور، شیفتہ، عشق اور کریم کے تذکروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ میرٹھ کا رہنے والا اور دربار حیدرآباد دکن کا شاعر تھا اور نسلاً یہودی تھا[1]۔ وہ عشق کا شاگرد تھا اور اُردو شاعری میں ممتاز درجہ رکھتا ہے۔

۶۹۔ تذکرہ نویسوں نے ایک اور مشتاق کا بھی ذکر کیا ہے جس کا نام محمد قلی تھا اور جس نے ۱۲۱۴ھ (۲-۱۸۰۱ع) میں انتقال کیا۔ اُس نے ہندوستان اور بنگال کے تمام ریختہ دیوانوں کو جمع کیا تھا۔ اشپرنگر[2] کا قول ہے کہ جس وقت شورش نے اپنا تذکرہ لکھا وہ ایک انتخاب کی ترتیب میں مصروف تھا۔ شاید اِن دو مشتاقوں کے ناموں میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔

۷۰۔ "چمن بے نظیر[3]" یا "مجمع الاشعار"۔ یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے دو اِڈیشنوں کے ہیں۔ دونوں بمبئی میں طبع ہوئے، ۱۲۶۵ھ (۴۹-۱۸۴۸ع) اور ۱۲۶۶ھ (۵۰-۱۸۴۹ع) میں پہلا انتخاب محمد حسین کا اور دوسرا محمد ابراہیم کا۔ غالباً یہ وہی محمد ابراہیم ہیں جنھوں نے انوار سہیلی کا دکنی میں ترجمہ کیا ہے، جو ۱۸۲۴ع میں مدراس میں شائع ہوا۔ اِس انتخاب کے دو حصّے ہیں۔ پہلا

---

[1] [سرور نے اِس مشتاق کا ذکر نہیں کیا۔ شیفتہ اور کریم نے اِس کو میرٹھی لکھا ہے لیکن اِس کے یہودی النسل ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔ عشق کا تذکرہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اشپرنگر نے مشتاق کا جو حال عشق کے حوالے سے لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتاق مولوی غلام احمد کا پوتا تھا۔ ایسی حالت میں اُس کو یہودی النسل سمجھنا کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ (ع)]

[2] فہرست اشپرنگر، جلد ۱۔ ص ۲۶۵۔

[3] یہ تاریخی نام ہے۔ اِس سے ۱۲۶۵ھ یعنی ۴۹-۱۸۴۸ع نکلتا ہے۔

۷۲ صفحے کا ہے جس میں صرف فارسی نظمیں ہیں، دوسرا ۲۴۹ صفحے کا، جس میں ۱۸۷ مختلف ہندوستانی شاعروں کی نظمیں ہیں۔

۷۱۔ "مجموعۂ دواوین"۔ ایک قلمی نسخہ جو حضور نظام[۱] کے کتب خانے میں ہے۔ مگر یہ 'انتخاب دواوین' سے جدا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

۷۲۔ "مجالسِ رنگین" اِس میں ہمعصر شعرا کا ذکر اور اُن کے کلام پر تنقیدی تبصرہ ہے۔ رنگین (سعادت یار خاں) اِس زمانے کے ممتاز شاعر اور مصنف ہیں۔ اُنھوں نے بہت سی نظمیں لکھی ہیں جو لکھنؤ اور آگرے میں چھپ چکی ہیں۔

۷۳۔ "گلستانِ مسرت[۲]"، شعرا کا یہ انتخاب مصطفیٰ خاں دہلوی کا مرتب کردہ ہے۔ مؤلف مطبع مصطفائی کے مالک ہیں، جہاں سے بہت سی ہندوستانی تالیفات شائع ہو چکی ہیں۔

۷۴۔ "گلدستۂ ہند" یہ لطائف کا مجموعہ ہے جس میں آٹھ باب ہیں اور ہر باب کا نام گلشن ہے۔ آٹھویں باب میں ایسے منتخب اشعار ہیں جو یاد کرنے کے قابل ہیں۔

۷۵۔ "معیار الشعرا"، قدیم و جدید شعرا کا کلام ہے جو آگرے سے (منشی قمرالدین گلاب خاں) ہفتے میں دو بار شائع کرتے ہیں۔

۷۶۔ آخر میں میں اپنے حافظے سے لکھتا ہوں کہ میاں مقبول نبی مقبول نے تین سو ہندوستانی قدیم و جدید شعرا کا کلام جمع کیا جس میں ساٹھ ہزار شعر تھے، مگر افسوس کہ اُس مجموعے کو آگ لگ گئی[۳]

---

[۱] تاریخ ادب ہندوستانی جلد ۱ صفحہ ۵۸۶۔

[۲] [یہ فارسی کلام کا اِنتخاب ہے۔ اشعار خاص عنوانوں کے تحت درج ہیں۔ عبدالحق]

[۳] گلشن بے خار' (منقول از اشپرنگر) وغیرہ۔ {اشپرنگر نے قاسم کا حوالہ دیا ہے۔ "مجموعۂ نغز"، میں اِس مجموعے کا ذکر ہے، 'گلشن بے خار' میں نہیں (چ)}۔

میں یہاں کتابوں کی فہرستوں کا ذکر نہیں کرتا، تاہم میرا خیال ہی کہ یہ بہت کارآمد ہوتی ہیں، خصوصاً حوالہ دینے کے لیے۔ میں نے اپنی "تاریخ ادب ہندستانی" کے بعض مقامات میں لکھنؤ کے[1] ایک صاحب آل احمد[2] کی قلمی فہرست سے بہت کام لیا ہی جو فارسی اور ہندوستانی قلمی نسخوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ ہی اور جس کی کتابت ۱۲۱۱ھ (۹۷ - ۹۶ ۱۷ع) میں ہوئی تھی[3]۔

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست بھی، جو فارسی اور دیوناگری دونوں حروف میں ہی، قابل ذکر ہی؛ کیوں کہ اُس سے بہت سی قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہی جو دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔

وہ مصنفین جن کا ذکر اصل تذکروں میں ہی

ایسے شعرا کی تعداد، جن کا ذکر تذکروں یا دوسری کتابوں میں آیا ہی اور جن تک میری دسترس، بلاواسطہ یا بالواسطہ ہو سکی، تقریباً تین ہزار ہی، جن میں سے سات سو کا تذکرہ میں اپنی کتاب "ہندوستانی ادب کی تاریخ" میں کر چکا ہوں۔ لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ یہ تمام مصنفین درحقیقت شاعر تھے۔ اِن کا شمار اِس ضمن میں اِس لیے کیا گیا ہی کہ تمام ہندوستانی مصنفین خواہ اُن کی

---

[1] کم سے کم ڈی فوربس صاحب کا یہی خیال ہی۔

[2] یہ نام، جو شاذ و نادر ہی اِستعمال ہوتا ہی، احمدی کا مترادف ہی۔ [مصنف نے لفظی معنے کی طرف خیال کر کے یہ لکھا ہی، مگر ہندستان میں اکثر اُن لوگوں کے نام بھی آلِ احمد، ابن حسن وغیرہ ہوتے ہیں جو آلِ رسول سے نہیں۔ ع۔ ص۔]

[3] اِس فہرست کے ایک نسخے کی اطلاع مجھے پروفیسر ڈنکن فوربس کی مہربانی سے ہوئی۔ بعد میں یہ نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں داخل ہُوا۔ ایک دوسرا نسخہ سرگور اوزلے کی کتابوں میں سے ہی۔ میرے دوست نیتھے نیل بلانڈ کے بیان کے مطابق اِس نسخے کی کتابت بارہرا (مارہرہ ؟) کے ایک باشندے نے ۱۲۱۱ھ (۹۷-۹۶ ۱۷ع) میں ایک اور نسخے سے کی تھی۔

تالیفات ریاضیات، طبعیات، قانون یا مذہب پر کیوں نہ ہوں، شعر ضرور کہتے تھے اور اس لیے شاعر کہلاتے تھے۔ علاوہ اس کے شاعر کا لفظ مبہم سا ہی جس سے مصنف کے معنے بھی نکلتے ہیں چنانچہ یورپ میں بھی بعض اوقات عامیانہ طور پر یہ لفظ انھیں معنوں میں آتا ہی۔

اس بنا پر شاعر سے مراد مصنف ہوگا۔ اگرچہ اصل تذکرے ایک قسم کے انتخابات ہوتے ہیں جس میں شعرا کا تذکرہ بھی ہوتا ہی، لیکن اُن میں (گو شاذ و نادر ہی کیوں نہ ہو) مصنفین اور مختلف قسم کے نثر نگاروں کے متعلق بھی بعض باتیں آجاتی ہیں۔

یہ سچ ہی کہ تمام مشرقی اور خصوصاً ہندوستان کی ادبیات میں شاعری غالب ہی۔ یہاں میرا مطلب صرف نظم سے نہیں جو لفظوں کا منظم مجموعہ ہوتا ہی بلکہ میرا مطلب اُن خیالات سے بھی ہی جو موزوں طور پر ظاہر کیے جاتے ہیں اور جو تمدّن کی اصل ہیں اور جن سے تمدّن کی حقیقت تاریخ کی نسبت زیادہ بہتر سمجھ میں آتی ہی۔ یہ سچ ہی کہ اِن شاعروں میں بہت سے ایسے ہیں جن پر ہوریس کے یہ اشعار صادق آتے ہیں۔

> "جو بُری نظمیں لکھتے ہیں، لوگ اُن پر ہنستے ہیں، لیکن تاہم اُنھیں شعر کہنے میں لُطف آتا ہی، اور اپنے متعلق وہ بڑی اچھی رائے رکھتے ہیں؛ اور گو آپ کچھ نہ کہیں، مگر وہ بڑے مزے سے آپ ہی آپ اپنی چیزوں کی تعریف کرتے ہیں"۔

علاوہ اس کے ہندوستانی کی نثر کی کتابیں بھی ایک حد تک شاعری سے تعلق رکھتی ہیں، کیوں کہ جیسا کہ مشرق کی دوسری اسلامی زبانوں میں ہی، نثر کی تین قسمیں ہیں۔ اِن میں سے صرف ایک قسم ایسی ہی جس کا مفہوم نثر ہی۔ پہلی

قسم مرجّز کہلاتی ہی، جس میں وزن تو ہوتا ہی مگر قافیہ نہیں ہوتا - دوسری مُسجّع، جس میں قافیہ ہوتا ہی مگر وزن نہیں ہوتا - اور تیسری عاری ہی، جس میں نہ قافیہ ہوتا ہی نہ وزن -

بہت سے ہندوستانی شاعروں نے فارسی میں بھی نظمیں لکھی ہیں جیسا کہ پہلے زمانے میں ہم (یعنی فرانسیسی) لاطینی اور فرانسیسی دونوں میں شعر کہتے تھے؛ اور روما میں یونانی اور لاطینی دونوں کے شاعر ہوتے تھے - جو اُن دو قدیم زبانوں میں شعر کہتے تھے وہ (Utriusque linguae scriptore) یعنی "دونوں زبانوں کے مصنّف" کہلاتے تھے - اِسی طرح ہندوستان میں ایک اور رسم پڑ گئی ہی جو اِس کا ثبوت ہی - یعنی جو شاعر دونوں زبانوں میں شعر کہنے کی قابلیت رکھتے ہیں، اُن کے دو تخلص ہوتے ہیں؛ فارسی میں ایک اور اردو میں دوسرا - مثلاً وجیہ الدین کے دو تخلص ہیں، ایک وجیہ اور دوسرا برنی؛ محمد خاں کے والہ اور ثاقب -

اب ہم اِن مصنفین کی، جو تعداد میں کثیر ہیں، تقسیم کرنا چاہتے ہیں - سب سے پہلا اور قدرتی اِمتیاز ہندو مسلمان کا ہی، مگر اِس کے ساتھ ہی یہ بھی ہی کہ بہت ہی کم مسلمانوں نے ہندی میں لکھا ہی، حالانکہ بے شمار ہندو ایسے ہیں جن کی تصانیف اُردو نیز دکھنی میں ہیں - اور پہلے تو وہ (جیساکہ سید احمد خاں نے اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں لکھا ہی اور جس کا اِقتباس میں دے چکا ہوں) فارسی میں بھی لکھتے تھے - تین ہزار ہندوستانی مصنف جن کا میں نے ذکر کیا ہی، اُن میں سے دو ہزار دو سو سے زائد مسلمان ہیں اور آٹھ سو کے قریب ہندو، جن میں سے صرف تقریباً دو سو پچاس نے ہندی میں بھی شعر کہے ہیں - حقیقت یہ ہی کہ اِس تقسیم کی رو سے مصنفین کی صحیح تعداد کا معلوم ہونا بہت مشکل ہی، کیوں کہ ہندی شاعروں کے تذکرے دستیاب نہیں ہوتے اور اِس وجہ سے اُن کی بہت بڑی

تعداد نا معلوم ہے - اُردو مصنفین کی یہ حالت نہیں، اصل تذکروں میں اُن کا ذکر آجاتا ہے ورنہ کم سے کم نام ہی لکھ دیا جاتا ہے -

ہندی میں لکھنے والے زیادہ تر پنجاب، کشمیر، راجپوتانے اور ممالک مغربی و شمالی کی قدیم سرزمین، دہلی، آگرے، برج، بنارس کے رہنے والے ہیں -

ٹھیٹ دکنی میں لکھنے والے صرف دو سو ہیں؛ اِس طرح گویا بہت بڑی تعداد شعرا کی اصل اُردو زبان میں ہے جو نہایت شستہ ہندوستانی خیال کی جاتی ہے -

اگر ہم اِن شاعروں کی جائے سکونت کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں مسلمانوں کی دونوں بولیاں نہ صرف اِستعمال ہوتی ہیں بلکہ اُن کی تعلیم و ترقی کی بھی کوشش کی جاتی ہے - دکن کے شہر یہ ہیں: سورت، بمبئی، مدراس، حیدر آباد، سرنگاپٹم، گولکنڈہ - اُردو کے مرکز یہ شہر ہیں: دہلی، آگرہ، لاہور، میرٹھ، لکھنؤ، بنارس، کان پور، مرزا پور، فیض آباد، الہ آباد اور کلکتہ جہاں ہندوستانی بطور صوبائی بولی کے بولی جاتی ہے -

امّن، جو پہلا ہندوستانی نثر نگار خیال کیا جاتا ہے، کلکتے میں بیٹھ کر اپنی ”باغ و بہار“ میں لکھتا ہے -

سو اُردو کی آراستہ کر زباں
کیا میں نے بنگالہ ہندوستاں

ہندو مسلمانوں کو محض ناموں سے پہچان لینا ایک آسان بات ہے، لیکن اِن ناموں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں - ایک دوسرے مضمون میں مَیں نے مسلمانوں کے ناموں اور القاب سے بحث کی ہے - یہاں میں صرف اِتنا لکھنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان شعرا کے ناموں کی چھے صورتیں ہیں، جن میں

[1] یہ نام کلکتے کی سمت کو مد نظر رکھتے ہوئے جو انگریزی حکومت کا دارالحکومت ہے، رکھا گیا ہے -

اُن کے نام اور لقب وغیرہ شریک ہیں ، بعض اِن میں سے دو دو تین تین ایک ساتھ ہوتے ہیں ، مثلاً علَم اور لقب ، جیسے غلام اکبر ، عماد علی ؛ کُنیت (جس سے اِبنیت یا اُبوّت ظاہر ہوتی ہی) جیسے ابو طالب ، اِبن ہشام ؛ نسبت جیسے لاہوری، قنوجی ؛ خطاب ، جیسے خان ، مرزا وغیرہ اور تخلص جو عام طور سے عربی یا فارسی اسم یا صفت ہوتا ہی مگر ہندی نہیں ہوتا۔

جیسے مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ مسلمان اولیا اور پیغمبروں کے نام ہوتے ہیں ، اُسی طرح ہندوؤں کے ناموں کے ساتھ اُن کے دیوتاؤں کے نام آتے ہیں ۔ مثلاً مسلمانوں کے نام یہ ہوتے ہیں : محمدؐ علی ، ابراہیم ،حسن، حسین وغیرہ اور ہندوؤں کے : ہر ، نراین ، رام ، لکشمن ، گوپی ناتھ ، گوکل ناتھ، کاشی ناتھ[1] وغیرہ ۔

جس طرح مسلمانوں کے معزز نام عبد العلی ، غلام محمد ، علی مردان وغیرہ ہیں ، اُسی طرح ہندوؤں کے ہاں شیوداس ،کرشن داس ، مادھوداس ،سورداس، وغیرہ ہوتے ہیں ۔

ہندو نہ صرف اپنے دیوتاؤں ہی کے بندے ہوتے ہیں بلکہ اپنے دریاؤں، پودوں اور مقدس شہروں کے بھی ۔ مثلاً گنگا داس ، تلسی داس ، آگرا داس ، کاشی داس ، متھرا داس ، دوارکا داس ۔

مسلمانوں میں محبوب علی ، محبوب حسین وغیرہ ہیں ، تو ہندوؤں میں شری لال، ہربنس لال وغیرہ ۔

اِسی طرح مسلمانوں میں عطاء اللہ ، عطا محمد ، علی بخش ہیں ، تو ہندوؤں میں بھگونت ، رام پرشاد ، شیو پرشاد اور کالی پرشاد ، بعض اوقات ہندوؤں کے نام

---

[1] یہ آخری تین نام سری کرشن کے ہیں ۔

مخلوط ہوتے ہیں یعنی ہندی فارسی سے ملے جلے، جیسے گنگابخش وغیرہ۔

برہمنوں کے ناموں کے ساتھ بطور اِعزاز کے چوبے، تواری، دوبے، پانڈے کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں؛ چھتریوں، راجپوتوں اور سکھوں کے ناموں کے ساتھ ٹھاکر، رائے اور سنگھ؛ ویشوں کے ساتھ ساہ یا سیٹھ: اہلِ علم کے ناموں کے ساتھ پنڈت اور سین؛ طبیبوں کے ساتھ مِسر[1]۔ ہندو فقیر گرو، بھگت گوسائیں یا سائیں کہلاتے ہیں اور سکھ فقیر بھائی[2]۔

ہندوؤں کی تقلید میں ہندی مسلمانوں کی بھی چار ذاتیں ہوگئی ہیں، سید، شیخ، مغل اور پٹھان۔ سید آنحضرت کی اولاد ہیں، شیخ عربی النسل ہیں، لیکن یہ لفظ نومسلموں کے ناموں کے ساتھ بھی اِستعمال ہوتا ہے، مغل ایرانی نسل کے لوگ ہیں اور پٹھان افغان ہیں۔

سید "میر[3]" کہلاتے ہیں؛ شیخوں کا کوئی خاص لقب نہیں؛ مغلوں کے ناموں کے ساتھ شروع میں "میرزا[4]"، یا آخر میں "بیگ"، نیز "آغا" اور "خواجہ" کے لقب بھی آتے ہیں۔ پٹھان "خان" کہلاتے ہیں۔ مسلمان فقرا کے ساتھ "شاہ"، "صوفی" یا "پیر" کے القاب استعمال ہوتے ہیں۔ اُن کے علما "مُلّا" یا "مولا" کہلاتے ہیں۔ خواتین کے ساتھ خانم، بیگم، خاتون، صاحبہ، صاحب، بی یا بی بی کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

"شری" اور "دیو" ہندوؤں کے اِعزازی القاب ہیں، پہلے کے معنی

---

[1] مسلمان طبیب "حکیم" کہلاتے ہیں۔

[2] ہندوستانی کے شعرا میں بھائی گورداس اور بھائی نندلال کے نام کے آتے ہیں۔

[3] اصل میں "امیر" تھا۔

[4] ایران میں یہ لفظ امرا کے بیٹوں یا شہزادوں کے نام کے آخر میں آتا ہے۔ نام کے شروع میں ہر پڑھے لکھے شخص کے لیے ایک عام لقب کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

"ولی" کے اور دوسرے کے معنے "دیوتا" کے ہیں، "شری" نام کے اوّل آتا ہو اور "دیو" آخر میں - یہ القاب شہروں، پہاڑوں اور دریاؤں وغیرہ کے ناموں کے ساتھ بھی آتے ہیں[1] - اگلے وقتوں میں گال (Gaul) بھی شہروں، پہاڑوں، جنگلوں وغیرہ کے ساتھ 'دیوس' یا 'دیو' کا لفظ استعمال کرتے تھے - یہ ہندی رسم تھی جو وہاں پہنچی تھی اور گنگا کے کنارے سے میوز (Muse)، مارن اور سین کے ساحلوں پر منتقل ہوگئی تھی - ہمارے زمانے میں روسی اب تک اپنے ملک کو "مقدس روس" (Holy Russia) کہتے ہیں - ہندوستان کے مسلمان بادشاہ اب تک اپنی ریاستوں کے مشہور یا درباری شاعروں کو "سید الشعرا" یا "ملک الشعرا" کے اسلامی خطاب یا "کبیشر"، "برکوی" وغیرہ کے ہندوانی خطاب عطا کرتے ہیں -

جو ہندو اُردو میں شاعری کرتے تھے مسلمانوں کی طرح اُن کے بھی تخلص ہوتے تھے - اور چوں کہ یہ تخلص عموماً فارسی ہوتے ہیں، اِس لیے کہ فارسی ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی زبان ہو، دونوں مذہب والے ایک ہی سے تخلص کرتے تھے، اِس وجہ سے تخلص دیکھ کر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ شاعر مسلمان ہو یا ہندو -

اِن مصنفوں میں کچھ ایسے ہندو بھی ہیں جو مسلمان ہوگئے ہیں، لیکن کوئی ایسا مسلمان نہیں جس نے ہندو مذہب اختیار کرلیا ہو، البتہ سکھوں کے فرقے میں (جو انتہائی اصلاح کا فرقہ تھا) بعض مسلمان شریک ہوگئے تھے، سکھ ایسے

---

[1] ایسی صورت میں مسلمان "حضرت" کا لفظ اِستعمال کرتے ہیں - جیسے حضرتِ دہلی، حضرتِ آگرہ - [خسرو نے دہلی کی تعریف میں کہا ہو: حضرت دہلی کنفِ دین و داد
جنّتِ عدن است که آباد باد
مترجم]

مسلمانوں کو "مذہبی" کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے ہندو مذہب کی طرف جانا ایک قسم کا تنزل ہے، مگر ہندو کا مسلمان ہوجانا ایک طرح کی ترقی ہے، کیوں کہ توحید اور عاقبت پر یقین رکھنا اسلام کے اصل عقائد میں سے ہے۔ علاوہ اس کے ابھی تک ہندوستان کے مسلمانوں میں عقل پرستی نے گھر نہیں کیا ہے، وہ اب بھی اپنے مذہب میں ویسے ہی پُرجوش ہیں اور اگرچہ ہندو مذہب کا رنگ اُن میں آگیا ہے، تو بھی وہ روزانہ ہندوؤں کو مسلمان بناتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو شاعر جو مسلمان ہوگئے ہیں، ترکِ دنیا کر کے اپنی نظموں میں توحید کے گیت گاتے ہیں۔ اُنھیں میں سے ایک "مضطر" (لالہ کنور سین) ہے، جس نے ایک بڑی اچھی نظم میں "شہادتِ حسین" کا واقعہ لکھا ہے۔ ایسے دس بارہ اور شاعر ہیں جن کا ذکر تذکروں میں آیا ہے۔

ہندوستانی کے مصنفین میں بعض ایسے ہندو بھی پائے جاتے ہیں جو عیسائی ہوگئے ہیں، نیز بعض مسلمان بھی ہیں، گو بہت شاذ و نادر، جنھوں نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا ہے۔ ایک اُردو کے شاعر کی نسبت جس کا تخلص "شوکت" ہے، شیفتہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

> "کہتے ہیں کہ شوکت بنارس میں ایک یورپین کا بہت بڑا دوست تھا اور اُسی کی ترغیب سے اُس نے اِسلام ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کرلیا (خدا ہمیں ایسی آفت سے پناہ میں رکھے) چنانچہ اُس نے اپنا نام بھی منیف علی سے بدل کر منیف مسیح رکھ لیا ہے"۔

ایسی حالت میں نام کی تبدیلی اکثر و بیشتر حالت میں ضروری ہوتی ہے۔ ہندوستانی زبان کے ایک اور شاعر نے جو عیسائی ہوگیا تھا اپنا نام فیض محمد سے فیض مسیح بدل دیا۔

مگر ہندؤوں کی حالت دوسری ہی - ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ابتدا میں جو ہندو عیسائی ہوے اُن کی تقلید میں بعد کے ہندؤوں نے باوجود مذہب بدلنے کے اپنے وہی نام رہنے دیے، حالانکہ اُن ناموں سے غیر مذہب کی بو آتی ہی - مثلاً ہمارے ہم عصر مصنفوں میں ایک صاحب بابو شری داس ہیں، جنھوں نے مسلمان ہونے کے بعد ایک کتاب خدا کی صفات پر لکھی ہی جس کا نام "صفات رب العالمین" ہی -

اصل تذکروں میں ہندوستانی زبان کے بعض ایسے شاعروں کا بھی ذکر آتا ہی جو ہیں تو یہودی نسل کے، مگر مسلمان ہو گئے ہیں - مثلاً میرٹھ کے جمال (علی) جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہی، ساٹھ سال ہوئے جب وہ حیدر آباد میں تھے؛ دہلی کے "جوان" (محب اللہ)، طبابت پیشہ اور شاعری میں "عشق"[1] کے شاگرد تھے؛ اور مشتاق جو ایک تذکرے کے مؤلف ہیں -

اکثر پارسی عموماً گجراتی میں اور کبھی کبھی فارسی میں لکھتے ہیں، مگر بعض ایسے بھی ہیں جو ہندوستانی میں لکھتے تھے - چنانچہ بمبئی کے بومن جی دوساجی نے شکنتلا ناٹک ہندوستانی میں لکھا ہی -

اِنھیں تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ ہندوستانی شاعروں میں یورپین عیسائی یا کم سے کم یورپین نسل کے لوگ بھی ہیں - مثلاً، یورپین سمرو[2] اور مشہور بیگم سمرو ملکۂ سردھنا المخاطب بہ زینت النسا کا بیٹا جس کا تخلص "صاحب" اور خطاب ظفریاب ہی - یہ دلسوز کا شاگرد تھا - اِس کی نظمیں موجود ہیں اور اچھی خاصی ہیں - دہلی میں اِس کے ہاں مشاعرے ہوتے تھے جن میں وہاں کے مشہور مشہور شاعر شریک ہوتے تھے - منجملہ اُن کے ایک شاعر سرور بھی تھا

---

[1] یعنی میر عزت اللہ عشق، ملاحظہ ہو مجموعۂ نغز - (پچم) - [کریم الدین نے صرف طب میں اِن کو "عشق" کا شاگرد بتایا ہی - ع - ص]

[2] تذکرہ نویسوں نے اِس کو مظفر الدولہ ممتاز الملک نواب ظفریاب خان بہادر خلف شمرو فرانسیس لکھا ہی (چ)

جس نے اِن شاعروں کا حال لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ خوش نویسی میں بھی اُسے کمال حاصل تھا (اس فن کی مشرق میں بڑی قدر ہوتی ہے) نیز موسیقی اور نقاشی میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ وہ عالمِ نوجوانی میں ۱۸۲۷ع میں اِنتقال کرگیا۔

اُس کا ایک دوست تھا جس کا عیسائی نام "پال تھازر" تھا اور تخلص اسیر کرتا تھا، ہندوستانی شعر خوب کہتا تھا۔ سُرُور کا بیان ہے کہ وہ بھی فرنگی اور نصرانی تھا اور اُس کے جو شعر اُس نے نمونے کے طور پر دیے ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی طبیعت میں جِدّت تھی۔

اُسی زمانے میں سردھنے کے چھوٹے سے دربار میں ایک تیسرا یورپین ہندوستانی شاعر بھی تھا جو فرانسیسی تھا اور لوگ اُسے "فراسو" یا "فرانسو" کہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ سردھنے کی بیگم کے ایک عہدہ دار آگسٹ یا آگسٹن کا بیٹا تھا۔ اُس کی نظمیں بہت اچھی ہیں اور وہ بھی "صاحب" کی طرح دہلی کے مشہور شاعر دلسوز کا شاگرد تھا۔

ہمارے زمانے میں بھی ایک انگریز عیسائی کا نام لیا جاتا ہے جو ہندوستانی زبان کا شاعر تھا اور جس کا نام تذکرہ نویس (کریم الدین) نے جارج بنس شور دیا ہے۔ غالبًا یہ نام جارج بُرٹش شور ہے۔ شور اُس کا خاندانی نام معلوم ہوتا ہے اور یہی اُس نے اپنا تخلص رکھا ہے۔

دو اور انگریز ہندوستانی شاعروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کا وطن دہلی تھا۔ ایک اِسفن ہے، یہ نام بلاشُبہ اسٹیفن یا اسٹیونس ہے۔ یہ ۱۸۰۰ع تک زندہ تھا: دوسرا جان تومَس یعنے ٹامس ہے جسے "خاں صاحب" بھی کہتے تھے۔ یہ دونوں شاعر غالبًا دوغلے تھے۔

اِسی قسم کے ایک اور ہندوستانی شاعر سے بھی مَیں واقف تھا، یعنی ڈائس سومبر

(سمرو) جو بیگم سمرو کا لے پالک بیٹا تھا، اِس شخص کا ذکر انگریزی اخباروں میں اکثر آیا ہی، کیونکہ وہ اپنے حقوق کے لیے برابر لڑتا رہا تھا۔ڈائس سمرو ہندوستانی شعر بلا تکلف کہتا تھا اور پڑھتا خوب تھا۔

ایک اور ہندوستانی شاعر کا بھی ذکر آیا ہی جو حبشی اور اس کا نام سیدی[1] حمید (حامد؟) "بسمل" تھا۔ یہ نام اُن ممتاز حبشیوں کی فہرست میں اضافہ کرنا چاہیے جن کی فہرست بشپ گری گرنے حبشی ادبیات (Litterature des Negres) میں دی ہی۔ اِس انیسویں صدی کی ابتدا میں ایک حبشی شاعر پٹنے میں رہتا تھا[2] معلوم ہوتا ہی کہ وہ غلام تھا۔

ہندی کے تقریباً تمام مصنفین ہندوؤں کے اصلاحی فرقوں یعنی جینیوں کبیر پنتھیوں، سکھوں، ویشنویوں سے تعلق رکھتے ہیں؛ اِن فرقوں کے بزرگ، مشہور سے مشہور اور نیز غیر معروف، سب ہندی کے شاعر تھے؛ مثلاً، رامانند، ولبھ، دریا داس، جے دیو (سنسکرت کی مشہور نظم گیتا گوبند کا مصنف)، دادو، بیربھان، بابالال، رام چرن، شیو نراین وغیرہ۔

شیوائیوں میں بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے ہندی میں کچھ لکھا ہی۔اِن میں سے اکثر قدیم زبان اور قدیم مذہب کے تابع رہے۔

اب رہے مسلمان، مذہبی حیثیت سے ہندوستان میں اِن کے دو فرقے ہیں، سُنّی اور شیعہ۔ سُنّیوں کو اکثر رومن کیتھلک عیسائیوں سے اور شیعوں کو پراٹسٹنوں سے تشبیہہ دی جاتی ہی، اِس لیے کہ شیعہ سُنّت یعنی اُن احادیث کو جو آنحضرت (صلعم) کے عمل کے متعلق ہیں نہیں مانتے (حالانکہ اُن احادیث کو

---

[1] یہ لفظ اصل میں سیّدی ہی اور ہندوستانی میں حبشی نسل کے لوگوں کے نام کے ساتھ آتا ہی۔

[2] دیکھو اشپرنگر، بیان عشقی (فہرست جلد ۱، صفحہ ۲۱۵)

جو آنحضرت کے اقوال ہیں مانتے ہیں) مگر شار دین، جو پروٹسٹنٹ تھا، اِس کے بالکل خلاف کہتا ہے - اِس کی وجہ شاید وہ رسوم ہیں جو شیعوں کے ہاں پائی جاتی ہیں[۱]-

اِن کے علاوہ ایک اور فرقہ ہے جس کے پیرو بانیٔ فرقہ کے نام پر "سید احمدی" کہلاتے ہیں - یہ ہندوستان کے وہابی ہیں اور وہابی ہی کہلاتے ہیں - بہت سے ہندوستانی زبان کے مصنّفین اسی فرقے کے ہیں؛ مثلاً حاجی عبداللہ، حاجی اسمٰعیل وغیرہ جن کا ذکر میں بعد میں کروں گا - ہندوستانی زبان کے مصنّفوں میں بہت سے مسلمان صوفی بھی پائے جاتے ہیں، جن میں سے اکثر اولیاءاللہ سمجھے جاتے ہیں، فقیر شعرا بھی ہیں نہ صرف فقرا بلکہ حقیقی گداگر جو بازار میں اپنی نظمیں بیچتے پھرتے ہیں -

دہلی کے مرزا مکرّم اور میاں کمترین معروف بہ پیرخاں[۲] ایسے ہی لوگوں میں سے تھے جو اُردوے معلّیٰ[۳] میں اپنی غزلوں کے پرچے دو دو پیسے کو بیچتے تھے - اِن گداگر شاعروں کے ساتھ ساتھ پیشہ ور شاعر بھی ہیں یعنی وہ صاحبِ علم جن کا کام صرف شاعری ہے اور اُسی میں لگے رہتے ہیں -

حالت یہ ہے کہ ہر طبقے میں بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ فرقوں میں بھی شاعر موجود ہیں - پھر بہت سے بادشاہ شاعر بھی ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے: "کلام الملوک ملوک الکلام[۴]"، علاوہ گولکنڈہ کے تین بادشاہوں کے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے،

---

[۱] [سنیوں کو کیتھولیکوں سے اور شیعوں کو پروٹسٹنٹوں سے نسبت دینا سراسر غلط ہے - ع - ص -]

[۲] اِن کا اِنتقال ۱۱۶۸ھ (۵۵ - ۱۷۵۴ع) میں ہوا - اب رہا "خان"، کا معزز خطاب، سو یہ ہندوستان میں ہر پٹھان اور افغان کے نام کے ساتھ لکھا جاتا ہے، ہمارا شاعر پٹھان تھا -

[۳] اس سے مطلب دہلی کا بڑا بازار ہے -

[۴] ۱۸۵۱ع میں ہندوستانی عدالتوں کے اِفتتاح پر -

اور بھی کئی بادشاہ شاعر ہوئے ہیں؛ بیجاپور کا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ، میسور کا بدنصیب بادشاہ ٹیپو؛ مغل بادشاہوں میں شاہ عالم ثانی اور بہادر شاہ ثانی، اودھ کے نوابوں اور بادشاہوں میں آصف الدولہ، غازی الدین حیدر اور واجد علی شاہ۔

اِسی طرح ہم ہندوستانی زبان کے شاعروں میں عورتوں کی شق الگ قائم کرسکتے ہیں۔ اِن میں سے اکثر کا ذکر میں نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے[1]۔ اِس مضمون میں جن کا ذکر میں نہیں کرسکا وہ یہ ہیں: شاہزادی "خالہ" یہ تخلص اُنھوں نے اِس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ اپنے بھتیجے نواب عمادالملک (فرخ آباد) کے محل میں اِسی نام سے پکاری جاتی تھیں، لیکن اُن کا خطاب "بدرالنسا" تھا[2]۔

یہاں میں اَمۃ الفاطمہ بیگم المتخلص بہ "صاحب" معروف بہ "جی صاحب"، یا "صاحب جی"، کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اُردو شاعروں میں خاص کر اپنی غزلوں کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ یہ ایک ممتاز شاعر "منعم"[3] کی شاگرد تھیں۔ منعم شیفتہ (تذکرہ نویس) نیز اور بہت سے شاعروں کے اُستاد تھے۔ وہ باری باری سے لکھنؤ اور دِلّی میں رہتی تھیں۔ لکھنؤ میں معز اللہ خاں نے اِن پر ایک مثنوی بھی لکھی ہے جس کا نام "قولِ غمیں" ہے۔

ایک اور عورت شاعر، جو باوجود ہندو نام کے غالباً مسلمان ہے، چمپا ہے۔ یہ نواب حسام الدولہ کے حرم میں تھی۔ قاسم نے اِسے اُردو شاعروں میں شمار کیا ہے[4]۔

طوائفوں میں ایک فرح یا فرح بخش ہے جو ہندوستانی میں شعر کہتی تھی۔ شیفتہ نے

---

[1] "ہندوستان کی شاعر عورتیں"، "اورینٹ ریویو" مئی سنہ ۱۸۴۵ء

[2] دیکھو عشقی، جس کا حوالہ اشپرنگر نے دیا ہے۔

[3] [ظاہرا مصنف نے سہواً "مومن"، کو "منعم"، لکھ دیا ہے۔ چ]

[4] [اِس نام کی کسی شاعر عورت کا ذکر قاسم نے اپنے تذکرے میں نہیں کیا ہے۔ چ]

ایک اور طوائف ضیا[۵۱] کا بھی حال لکھا ہی۔ عشقی نے ایک تیسری کنچن نامی کا بھی
ذکر کیا ہی۔ ایک اور چوتھی طوائف ہندوستانی شاعر ہونے کے لحاظ سے اِن سب
سے زیادہ مشہور ہی۔ وہ "جان" (میر یار علی "جان صاحب") کہلاتی تھی[۵۲]
وہ فرخ آباد کی رہنے والی تھی، مگر زیادہ تر لکھنؤ میں رہتی تھی، جہاں اُس کی شاعری
کی بڑی شہرت ہوئی۔ عنفوانِ شباب ہی میں اُس نے موسیقی اور ادب کا شوق
پیدا کیا اور فارسی بھی پڑھی۔ لیکن ہندوستانی شاعری کی وہ دلدادہ تھی۔ کریم
(تذکرہ نویس) اُسے اپنا اُستاد سمجھتا ہی اور شعر میں اُس سے مشورہ کرتا تھا۔
اُس کا کلام لکھنؤ میں ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ع) میں شائع ہوا جو زنانہ بولی میں ہی
اُس وقت اُس کی عمر ۳۶ سال کی تھی[۵۳]۔ اُس کے کلام کی بہت شہرت ہوئی۔
یہاں ایک ہندو شاعرہ کا ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہی۔ اُس کا نام
رام جی[۵۴] تھا اور تخلص "نزاکت"۔ وہ نارنول کی رہنے والی تھی اور اُس کے غیر معمولی
حسن اور غیر معمولی ذہانت کی تذکروں میں بے حد تعریف ہی اور ۱۸۴۰ع تک زندہ
تھی۔ "تصویر" اور "ثریا" بھی شاعر عورتیں ہیں جن کا حال ہمیں باطن اور کریم کے
تذکروں سے معلوم ہوتا ہی۔ ایک عورت "یاس" تخلص ہی، نام میاں بانو
اور رہنے والی حیدرآباد کی۔ فیض دہلوی کی شاگرد ہی اور پندنامۂ عطار کی مترجم۔
اِس مضمون کی ایک اور اہم تقسیم سنہ واری ہو سکتی ہی۔ لیکن بعض اوقات

---

۵۱ شیفتہ نے اس تخلص کی کسی شاعرہ کا ذکر نہیں کیا (ج)
[معلوم ہوتا ہی مصنف نے "جینا" کو "ضیا" پڑھا۔ ع۔ص]

۵۲ [مصنف کو نام اور کلام سے دھوکا ہوا ہی یہ عورت نہیں مرد ہیں اور اُردو کے مشہور شاعر ہیں جو
عورتوں کی زبان میں شعر کہتے تھے۔ عبدالحق]

۵۳ [کریم الدین نے جان صاحب کو نہ فرخ آباد کا رہنے والا بتایا ہی نہ اُسے اُستاد کہا ہی۔ ۱۸۴۷ع میں
اُس کی عمر ۲۶ یا ۲۷ برس کی بتائی ہی۔ ع۔ص۔]

۵۴ ["گلشن بیخار" میں اِس کا نام "رجو" لکھا ہی۔ ع۔ص۔]

یہ بہت مشکل ہوتی ہے؛ خصوصاً قدیم شعرا کے معاملے میں کیونکہ اُن کے حالات نہیں ملتے۔ اِس تقسیم کی رو سے ہمیں سب سے پہلے ہندو شاعر[1] ملتے ہیں اور گیارھویں صدی میں[2] مسلمان شاعر مسعودِ سعد، جس پر "نے تھیبنیل بلانڈ" نے "ژورنال آسیاتیک" بابت ۱۸۵۳ء میں ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ بارھویں صدی میں "چند" ہے جو راجپوتوں کا ہومر کہلاتا ہے، اور "پیپا" جس کی نظمیں سکھوں کے "ادی گرنتھ" میں ہیں۔ تیرھویں صدی میں "سعدی" ہے جسے (جیساکہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) اُردو زبان میں[3] شعر کہنے سے عار نہ تھا اور "بیجو باورا" بھی اِسی زمانے میں ہوا ہے۔ اور چودھویں صدی میں خسرو دہلوی اور نوری حیدر آبادی[4] ہیں۔

اِن کے علاوہ ہندوستانی کے اور بہت سے مصنف ہیں جو اِنھیں صدیوں میں یا اِس سے قبل ہوئے ہیں۔ سنٹرل انڈیا کے کتب خانوں میں بلاشبہہ بعض نامعلوم قدیم ہندی تصانیف محفوظ ہیں۔ بہر حال ایسے بہت سے ہندی گیت موجود ہیں جو لوگوں میں عام طور سے مقبول ہیں اور جن سے ہندوستان کی زبان کا اِرتقا قدیم ترین زمانے سے معلوم ہوتا ہے۔

پندرھویں صدی میں جدید فرقوں کے پہلے بانی نظر آتے ہیں جنھوں نے

---

[1] ہندی کے اکثر شاعروں کے صحیح سنہ و تاریخ کا ملنا بہت مشکل ہے۔ میں ایک سنسکرت کے شاعر امر سنگا کا نام لے سکتا ہوں جس نے ہندی میں بھی شعر کہے ہیں؛ یہ نویں صدی کا شخص ہے۔ دیکھو میری تاریخ جلد دوم، صفحہ ۴۳۔

[2] ۱۰۸۰ء کے قریب۔

[3] ۱۲۰۵ء کے قریب۔ یہاں بھی مصنف کو دھوکا ہوا ہے۔ یہ سعدی شیرازی نہ تھے۔ عبدالحق]

[4] [نوری حیدر آبادی ۱۷ویں صدی عیسوی کے آخر کا شاعر ہے۔ چ]

مذہبی اور اخلاقی اغراض کے لیے ہندی میں بھجن اور شعر لکھنے شروع کیے۔ اِن میں ایک "کبیر" ہیں جو سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں کیونکہ اُنھوں نے سنسکرت کے اِستعمال کے خلاف سب سے زیادہ کوشش کی، اُن کے چیلوں میں سرت گوپال داس "سکھ ندھان[۱]" کا مؤلف اور دھرم داس مؤلف "امرل[۲]"، نانک اور بھگوداس بہت مشہور ہیں اور میں اُن کے متعلق دوسری کتابوں میں جو کچھ لکھ چکا ہوں[۳] اُس کا اِعادہ کرنا نہیں چاہتا۔ لالچ "دبگھوت" کا مؤلف ہی جس نے یہ کتاب مغربی ہندوستانی میں لکھی ہی۔

سولھویں صدی کے ہندوؤں میں ایک سُکھ دیو ہیں جن کے متعلق پریاداس (تذکرہ نویس) نے ایک خاص مضمون لکھا ہی۔ پھرنا بھاجی، جس نے نظم میں ایک تذکرہ لکھا ہی جو "بھگت مالا" کا بنیادی ماخذ ہی؛ دلبھا اور دادوٗ دونوں ایک ایک فرقے کے بانی اور مشہور شاعر ہوئے ہیں؛ بہاری جو "ست سئی[۴]" کا مشہور مصنف ہی اور گنگا داس مؤلف "صنائع و بدائع"، اور اور بہت سے مصنّف۔

شمالی ہند کے مصنّفین میں ابوالفضل، شہنشاہ اکبر کے وزیر اور بایزید انصاری سردار فرقۂ روشنائی یا جلالی ہیں۔ دکن[۵] کے مصنّفین میں، افضل (محمد)

---

[۱] اِس کتاب کے حالات کے لیے میری تاریخ کی جلد اول میں میرا مضمون کبیر پر دیکھو۔

[۲] دیکھو میری "ہندی زبان کے مبادی" کا دیباچہ صفحہ ۵۔

[۳] دیکھو میری تاریخ اور "ہندی زبان کے مبادی" کا دیباچہ۔

[۴] اِن اشخاص کے حالات کے لیے مذکورۂ بالا کتابیں دیکھو (حاشیہ صفحہ ۱-۳)

[۵] کمال نے قائم کے حوالے سے لکھا ہی۔ لیکن اُس کا ایک انتخابی شعر جو درج کیا ہی وہ قائم نے عبداللہ قطب شاہ سے منسوب کیا ہی۔ افضل کو قائم "از سُکّان دیار مشرق" لکھتا ہی اور کمال "از سُکّان قصبہ جنجانہ" ایسی صورت میں اُس کے وطن کے متعلق مؤلف نے غلطی کی ہی۔ نیز کمال نے اُس سے دوسرے کا شعر منسوب کر دیا ہی۔ [ج]

جس کی نسبت کمال اپنے تذکرے میں لکھتا ہی۔

"اِس کے کلام میں صفائی نہیں ہی اِس لیے کہ اُس کے زمانے میں ریختے کی شاعری زیادہ مقبول نہیں ہوئی تھی اور دکنی میں لکھنے پر مجبور تھا"،

محمد قلی قطب شاہ، بادشاہ گولکنڈہ، جس کا عہدِ حکومت ۱۵۸۲ سے ۱۶۱۱ تک رہا، اور اُس کا جانشین عبداللہ قطب شاہ دونوں خاص کر ہندوستانی ادب کی بڑی سرپرستی کرتے تھے۔

سترھویں صدی میں ٹھیٹ اُردو شاعری کا ذوق صحیح اصول و قواعد کے ساتھ خاص کر دکن میں پیدا ہوا۔ اِس دور کے ہندو شعرا میں سے میں صرف تین ہی کا نام لوں گا،

یعنی سورداس، تلسی داس اور کیشوداس، جو اِس زمانے کے اہلِ ہند میں بہت مقبول شاعر ہیں اور جن کی نسبت یہ مشہور قول ہی کہ

"سورداس سورج ہی، تلسی داس چاند، کیشوداس ستارہ، دوسرے شاعر جگنو ہیں جو یہاں وہاں اپنی چمک دکھا جاتے ہیں"۔

اُردو شاعروں میں قابلِ ذکر یہ ہیں: "حاتم"، جن کا ذکر ہو چکا ہی، "آزاد" (فقیر اللہ) جو اگرچہ حیدرآبادی تھے مگر دہلی میں جا بسے تھے اور وہیں اُنھیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ جیون (محمد)[1] جو بہت سی مذہبی کتابوں کے مصنّف ہیں۔

دکن کے شاعر یہ ہیں: "ولی"، جو بابائے ریختہ کہلاتا ہی؛ شاہ "گلشن" ولی کا اُستاد[2]؛ "احمد" گجراتی؛ تانا شاہ، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہی؛ "شاہی" بھاگ نگری

---

[1] [اِس نام کا کوئی شاعر نہیں ملتا جو مذہبی کتابوں کا بھی مصنّف ہو۔ عجب نہیں کہ دتاسی نے جنون کو جیون پڑھا ہو۔ محمد فخر الاسلام "جنون" "میر ممنون" کے شاگرد تھے اور دلّی کے مشائخ زادوں میں سے، اور ممکن ہی کہ انھوں نے مذہبی کتابیں بھی لکھی ہوں۔ ع ج ص]

[2] [شاہ گلشن برہان پوری تھے دہلی میں جا بسے تھے "ولی"، اُن سے اُس وقت ملا تھا جب کہ اُس کی شاعری میں پختگی آ چکی تھی۔ مولف کو غالباً اِس وجہ سے دھوکا ہوا ہی کہ بعض تذکرہ نویسوں نے یہ لکھا ہی کہ شاہ صاحب نے ولی کو فارسی مضامین کو اُردو میں منتقل کرنے کی ہدایت کی تھی۔ ج]

اور مرزا ابوالقاسم، تانا شاہ کا عہدہ دار؛ عوری یا ابن نشاطی[۱]، پھول بن کا مصنف؛ غواص یا غواصی، مصنف طوطی نامہ؛ "محقق"، دکن کا ایک نہایت قدیم شاعر جس نے ایسے ریختے میں شعر کہے ہیں جو ہندوستانی سے ملتا جلتا ہے، رسمی، خاور نامے[۲] کا مصنف؛ عزیز (محمد) وغیرہ۔

اٹھارھویں صدی کے ایسے ہندوستانی شعرا کے ذکر میں زیادہ وقت صرف ہوگا جنھوں نے اپنے ہم عصروں میں نام پایا ہے۔ ہندی مصنفین میں ہم صرف اِن کا ذکر کریں گے: گنپتی، ایک رسالے کا مصنف، جس میں ہندوؤں کی مختلف فلسفیانہ تعلیمات کا بیان ہے؛ بیربھان، سادھوؤں کے ایک مشہور فرقے کا بانی اور معروف مذہبی نظموں کا مصنف[۳]؛ رام چرن ایک فرقے کا بانی، جو اُس کے نام سے مشہور ہے؛ اور مذہبی نظموں کا مصنف[۴] شیو نراین، یہ بھی ایک فرقے کا بانی اور ہندی نظم کی گیارہ کتابوں کا مصنف ہوا ہے۔ اِن نظموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بجائے "شری گنیشیا نما"، کے "سنتا سرن" (اولیا کے محافظ) کے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں۔

اُردو مصنفین میں صرف چند کا ذکر کروں گا: سودا[۵]، میر اور حسن گزشتہ صدی (اٹھارھویں) کے تین نہایت مشہور شاعر گزرے ہیں، جرأت، آرزو، درد، یقین،

---

[۱] یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ [ابن نشاطی کا دوسرا نام عوری نہیں تھا جیسا کہ اوپر ص ۱۰۱ حاشیہ ۱ میں ہم نے اس کو واضح کیا ہے۔ چ]

[۲] [یہ نام اصل میں رستمی ہے۔ دیکھو فہرست قلمی کتب، انڈیا آفس۔ عبدالحق۔]

[۳] اِس نظم کی تفصیل میں دے چکا ہوں۔ دیکھو میری تاریخ ادب، جلد ۲۔

[۴] دیکھو ہندوستانی ادبیات کی تاریخ اور ہندوی مبادی کا دیباچہ۔

[۵] سودا، ملک الشعرائے ریختہ کہلاتا ہے۔

فغاں، امجد دہلوی، امین الدین بنارسی، عاشق غازی پوری - دکنی شعرا میں ایک حیدرشاہ مرثیہ گو ہی، علاوہ مرثیوں کے اُس کے مخمس بھی یادگار ہیں، اِس میں اُس نے ولی سے ترقی کی ہی - ابجدی ایک اور دکنی شاعر ہی جو قابل ذکر ہی - اُس نے ایک چھوٹی سی منظوم انسائیکلوپیڈیا[51] لکھی ہی جس کا ہر باب مختلف بحر میں ہی اور ہر بحر کا نام باب کے شروع میں بتا دیا ہی - سراج اورنگ آبادی نے تقریبًا ۱۷۵۴ع میں وفات پائی - عزلت سورتی بھی دکن کے مشہور شعرا میں سے تھا - اُس کا انتقال ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ع) میں ہوا[52]-

اُنیسویں صدی کے نہایت ممتاز مصنفین یہ ہیں - ہندی میں: بھگت ورِث جس نے جینیوں کے عقائد و تعلیم کو نظم میں لکھا ہی؛ دلہارام تذکرہ نویس اور اُس کا جانشین چترداس رام سنیہیوں میں خاص عظمت رکھتے ہیں[53]-

اُردو میں: صہبائی اور کریم مومن دہلوی کا نام لیتے ہیں جو بہت خوش گو اور فصیح شاعر تھا، ۱۸۵۲ع میں انتقال کیا، اِس کا دیوان "بے نظیر" کہا جاتا ہی؛ نصیر جس کا انتقال ۱۸۴۲ یا ۱۸۴۳ع میں ہوا اور آتش جس نے ۱۸۴۷ع میں انتقال کیا - اِن دونوں نے دیوان مرتب کیے جو بہت مقبول ہوئے - مول چند جس نے ملخص شاہ نامے کا نظم میں ترجمہ کیا ہی؛ ممنون بھی بہت مشہور شاعر ہوا ہی - اِن کے علاوہ اور بہت سے ہیں جن کا ذکر میں ابتدا میں کر چکا ہوں -

---

[51] تحفۃ الصبیان -

[52] سراج کا سنہ وفات ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۳ع ہی -

[53] دیکھو میری تاریخ ادب ج ۱، ص ۱۶۱

دکنیوں میں صرف کمال حیدرآبادی اور عبدالحق مدراسی کا ذکر کروں گا۔
تذکرہ نویسوں نے جس ڈھنگ سے اپنے شاعروں کا ذکر کیا ہی، اگر ہم اُس کا لحاظ کریں تو ہم آسانی سے اُن کی تین تقسیمیں کر سکتے ہیں: وہ شاعر جن کا صرف ذکر آیا ہی؛ وہ جن کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا ہی؛ وہ جن کا ذکر زیادہ خصوصیت اور عزّت سے کیا گیا ہی۔ اوّل صف میں مَیں اُن کو شریک کروں گا جن کے حالات کی کوئی تفصیل نہیں، بلکہ بعض اوقات صرف نام، وطن اور نمونے کے چند اشعار پر اکتفا کیا گیا ہی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے صرف چند ہی غزلیں لکھی ہیں اور صاحب دیوان نہیں ہیں یا جن کی متفرق طویل نظمیں ہیں مگر اُن نظموں کے نام معلوم نہیں۔ دوسری صف میں وہ ہیں جو صاحب دیوان یا صاحب کُلّیات ہیں جس کی تشریح آگے چل کر کی جائے گی۔ آخر میں تیسری صف ہی جو نظم و نثر دونوں کے مصنف ہیں، اگر ہندی کے مصنف ہیں تو اکثر و بیشتر اُن کی کتابیں سنسکرت نثر میں ہیں اور اگر اُردو یا دکنی کے ہیں تو فارسی عربی نثر میں۔

تصنیفات جن کا ذکر تذکروں میں آیا ہی

ہندوستانی میں ادب کے مختلف اصناف کا اِمتیاز صرف الفاظ کی ظاہری شکل سے کیا جاتا ہی، معنی کی نسبت الفاظ زیادہ اہم خیال کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ غزل ایک مختصر نظم ہی جس میں ایک ہی قافیے کے چھے سے بارہ تک[1] شعر ہوتے ہیں، پہلے دو مصرعوں میں قافیے کا اِعادہ ہوتا ہی، لیکن مضمون کی کوئی خاص پابندی یا پروا نہیں کی جاتی۔ ممکن ہی کہ سنجیدہ ہو یا سخیف، لیکن اکثر ایک ہی ساتھ عاشقانہ بھی ہوتا ہی اور صوفیانہ بھی۔ غزل پٹرارک اور شکسپیر کے خاص رنگ کا سانٹ (Sonnet) ہی۔ شکسپیر نے اِس مشہور

---

[1] [پانچ سے اکیس تک ۔ ع ۔ ص ۔]

اطالوی شاعر کے رنگ میں اپنے سانٹ لکھے ہیں جو بہت لطیف ہیں، لیکن اُن کا چرچا بہت کم ہی۔ اُس کے ڈراموں نے اُن کو مدھم کردیا ہی۔ قصیدہ بھی بظاہر اِسی قسم کی نظم ہوتی ہی، لیکن وہ یا تو مدح میں ہوتی ہی یا ہجو میں یا کسی دوسرے مضمون پر۔

مثنوی ایسی نظم ہی، جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں؛ اور وہ ہر قسم کے مضمون پر ہوسکتی ہی۔ مختصر بھی ہوتی ہی اور طویل بھی۔ کوئی مثنوی تو دو ہی تین صفحے کی ہوتی ہی اور کوئی ہزار صفحے سے بھی زیادہ کی۔ ہندوستانی شعرا نے مثنوی میں ہر قسم کے مضمون لکھے ہیں، قصّہ، فسانہ، اخلاق مذہب، غرض درشت و نرم، سنجیدہ و سخیف ہر طرح کے مضامین آگئے ہیں۔

تین، چار، پانچ، چھے، سات، آٹھ، دس مصرعوں والی نظمیں مثلث، مربّع، مخمّس، مسدّس، مسبّع، مثمّن، معشّر کہلاتی ہیں؛ یہ شکوہ و شکایت، مرثیہ، خوشی کے گیتوں، مبارک باد یا کسی دوسری قسم کے مضامین پر مشتمل ہوتی ہیں۔

نظم کی بعض ایسی قسمیں بھی ہیں جن کے نام سے مضمون کا تعیّن ہوتا ہی، لیکن حقیقت میں وہ اُسی مضمون تک محدود نہیں ہوتیں۔ مثلاً ساقی نامہ جو پینے پلانے کی نظم ہونی چاہیے، مگر اکثر اُس میں دوسری قسم کے مضامین ہوتے ہیں مثلاً حیدر (حیدر بخش) کا ساقی نامہ حضرت علی کی منقبت میں ہی۔

یہی حال ہندی شاعری کا ہی۔ نظم کے نام اور مضمون میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً پد ہر چیز پر ہوسکتا ہی، اِسی طرح ٹپا ہولی کے گیتوں میں بھی کام آتا ہی اور شادی بیاہ کے وقت بدھاوے کی نظموں میں بھی۔

مسلمانوں کی چھوٹی نظموں میں تصوّف کا رنگ ہوتا ہی جس سے فوراً یہ معلوم ہوجاتا ہی کہ یہ کس کی لکھی ہوئی ہیں۔ ہندوستانی میں فارسی کی طرح عورتوں کے

حسن کو امردوں کی مناسبت اور مشابہت سے بیان کرتے ہیں ۔

ہندی زبان میں اِس کے خلاف عشق کا اظہار عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اُردو میں بھی کبھی کبھی اِس کی تقلید کی جاتی ہے اور اِس قسم کی نظم کا نام ریختی (ریختہ کا مؤنث) ہے ۔ انشاء اللہ خاں نے اِس صدی کی ابتدا میں اس قسم کی نظم کو رواج دیا ۔

اُردو میں بھی شاعری کے وہی اصناف اور بحریں ہیں جو فارسی میں ہیں، البتہ دو تین قسم کی نظمیں ایسی ہیں جو ہندوستانی زبان سے مخصوص ہیں؛ اُن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا ۔

شروع شروع میں عربی میں دیوان نظموں کا سادہ مجموعہ ہوتا تھا، جیسے دیوان متنبی، دیوان ابن فارض، دیوان امرءالقیس ۔ یہ گویا مشہور شعرا کے کلام کا مجموعہ تھا ۔ لیکن اب عربی میں نیز مسلمانوں کی دوسری مشرقی زبانوں مثلاً ہندوستانی، پشتو، فارسی اور ترکی میں دیوان غزلوں کے ایسے مجموعے سے مراد ہے جو قافیے کے لحاظ سے بہ ترتیب حروف ابجد مرتب کیا گیا ہے ۔ جب دوسری قسم کی اور نظمیں شامل کرلی جاتی ہیں تو وہ کلیات (یعنی شاعر کا کل کلام) کہلاتا ہے، جس میں کئی دیوان یا ایک ہی دیوان اور بہت سی اور نظمیں ہوتی ہیں ۔ یہ دونوں لفظ یعنی دیوان اور کُلّیات ایک ہی شاعر کے کلام کے متعلق اِستعمال ہوتے ہیں۔ دُہڑوں، کبتوں اور اشلوکوں کے مجموعے کو جو عموماً دیوناگری میں لکھے ہوتے ہیں یہ نام نہیں دیے جاتے ۔

سوائے بعض بعض حالتوں کے دیوانوں اور کُلّیاتوں کے خاص نام نہیں ہوتے ۔ مثلاً دیوان اختر (واجد علی شاہ) بادشاہ اودھ کے دیوان کا نام "فیض بنیان"[1]

---

[1] اِس دیوان میں جو لکھنؤ میں ۱۲۵۹ھ (۴۴-۱۸۴۳) میں طبع ہوُا، ہر غزل کے سرے پر بحر کا نام بھی لکھ دیا ہے، یہ عربی بحور کے مطالعے کے لیے بہت کارآمد ہے ۔

اور جوش (احمد حسن) کے دیوان کا نام "گلدستۂ سخن" ہی، رشک کے دو دیوانوں کے نام "نظم مبارک" اور "نظم گوہریں" ہیں، اور کلیات طپش "گلزار مضامین" سے موسوم ہی۔

اُن چھوٹی نظموں میں، جن کے مجموعے دیوان کہلاتے ہیں، اکثر و بیشتر صوفیانہ عاشقانہ مضامین ملے جلے ہوتے ہیں، کیونکہ مسلمان، جن کی تعداد شعرا میں زیادہ ہی، حسنِ ازلی اور مخلوق کے حُسن کو گڈمڈ کر دیتے ہیں جو ہماری نظروں میں خلاف تقدس ہی۔ وہ خدا کا جلوہ عورت یا امرد میں دیکھتے ہیں اور اِس لیے کبھی کبھی خالص روحانی اشعار کے ساتھ عیّاشانہ بلکہ فحش[1] شعر بھی آجاتے ہیں۔ یورپین اور عیسائی خیالات کی نظر سے اِس خاص قسم کی نظموں کا اندازہ اُن ترجموں سے ہو سکتا ہی جو میں نے "دیوان ولی" کے بعض حصّوں کا کیا ہی، یا غزلوں کے بہت سے ترجمے جو میں نے اپنی "تاریخ ادبیات" میں دیے ہیں یا عام مقبول گیت جن کا ترجمہ میں نے رسالہ (Revue Contemporaine) جلد ۱۵ صفحہ ۶۲ ۵ پر دیا ہی بہت ہی پاکیزہ ہیں اور میری رائے میں بعض اوقات پندار (Pindare) اور کبھی اناکریئوں (Anacreon) کی نظموں یا حافظ کی غزلوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس میں تو شبہہ ہی نہیں کہ ترکی شاعر "باقی" کی غزلوں سے کہیں بہتر ہیں۔

اِن مجموعوں کا بڑا نقص یکسانی ہی۔ ایک ہی سے خیالات ہیں جو بار بار اُسی طرز اور اُسی قسم کے جملوں میں دُہرائے جاتے ہیں۔

بھرتی کے شعر بہت زیادہ ہوتے ہیں، معلوم ہوتا ہی بٹلر نے یہ شعر

---

[1] اِس سے میری مراد اُن فحش نظموں سے نہیں جو عام طور پر فحش مانی جاتی ہیں۔ مثلاً جرکین کی نظمیں، جس کے نام ہی سے غلاظت ٹپکتی ہی۔

مشرقی شاعروں ہی کے لیے لکھا تھا۔

"جو لوگ اب تک نظم مقفّیٰ لکھتے ہیں
وہ ایک مصرع کی خاطر دوسرا مصرع کہتے ہیں"

سوائے اُن چند مشہور دیوانوں کے جو قبولیت اور شہرت حاصل کر چکے ہیں، دوسرے دیوانوں کا پڑھنا وبالِ جان ہی۔

اِن غزلوں میں ایک اور عیب ایہام کا ہی۔ اِسے اہلِ مشرق بڑی خوبی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ اُس اصول کو تسلیم نہیں کرتے جو ریارت (Yriarte) نے بندر اور بازی گر کی کہانی میں بتایا ہی ("Sin claridad no hai obra buena")

ہندوستانی دیوانوں میں ولی کا دیوان بہت مشہور ہی تاہم یہ معلوم ہوتا ہی کہ ممالک مغربی و شمالی میں بہت کم پڑھا جاتا ہی، اِس لیے نہیں کہ وہ دکنی بولی میں ہی بلکہ اِس لیے کہ اُس کا طرز پُرانا ہی۔ سودا، میر، درد، جرأت اور یقین کے کلام کا یہ حال نہیں، جو اُس کے مقابلے میں زیادہ جدید ہیں اور اب تک مقبول ہیں۔

ہمارے ہم عصر شاعروں میں آتش، ذوق، نوید اور نظیر کے دیوان زیادہ قابل لحاظ ہیں۔

اِن دیوانوں کے آغاز اور آخر میں جو نظمیں ہیں وہ مختلف قسم کی ہیں۔ میں اُن کے متعلق اپنی "تاریخ ادبیات" نیز ایک علیحدہ مضمون میں لکھ چکا ہوں۔ تکرار سے بچنے کے لیے میں صرف اُن چند کا ذکر کروں گا جن کے متعلق میں نے پہلے کچھ نہیں لکھا ہی۔

اول فرد ہی۔ اِس کے نام ہی سے اِس کے معنے ظاہر ہیں یعنی علیحدہ شعر، یہ دو مصرعوں کی ایک بیت ہی۔ دیوان کے آخر میں اکثر بہت سے فرد ہوتے ہیں

جو "فردیات" کے عنوان کے تحت میں لکھ دیے جاتے ہیں[1]۔
نوحے (سوز) ایک ہی شخص پڑھتا ہے، اُسے بازو کہتے ہیں، لیکن ٹیپ کے مصرعوں کو جو دُہراتے ہیں وہ جواب کہلاتے ہیں۔
عیدی وہ ہے جو ہندو مسلمانوں کے تہواروں کے لیے لکھی اور گائی جاتی ہے۔
مختصر سی نظم جسے معمّا یا لُغز کہتے ہیں، اُسے (Logogriphe) سمجھنا چاہیے۔
چھوٹی نظمیں جن میں چھوٹی بحر کے شعر ہوتے ہیں، مقطعات[2] کہلاتی ہیں۔
آنحضرت صلعم اور بعض اوقات خلفا اور آئمہ کی تعریف میں نعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو خاص طور سے لکھی جاتی ہیں اور مسلمان اپنی کتابوں کی ابتدا اُن سے کرتے ہیں۔
سالگرہ، وہ نظم جو سالگرہ کے موقع پر کہی گئی ہو۔
واسوخت (یا سوز) کسی قدر غزل ہی جیسا ہوتا ہے، کیونکہ اُس میں بیس تیس بند ہوتے ہیں۔ اِس کے تین شعروں میں سے پہلے دو ہم قافیہ ہوتے ہیں اور تیسرے کے دو مصرعے الگ ہم قافیہ ہوتے ہیں۔
میر جعفر زٹلی کی سی نظمیں زٹلیات کہلاتی ہیں جو آدھی فارسی اور آدھی ہندوستانی ہوتی ہیں۔
میں آخر میں ایک ایسی چیز کا ذکر کرتا ہوں جو صرف ہندوستان ہی سے مخصوص ہے، اِسے نسبتیں کہتے ہیں۔ اِس میں کئی جملے ہوتے ہیں جن میں بظاہر

---

[1] [یہاں سے ص ۱۱۳ (مثنویوں کے ذکر) تک کا حصّہ لکچر میں موجود نہیں۔ بعد میں جب یہ خطبہ کتابی شکل میں شائع ہُوا تو یہ حصّہ اضافہ کیا گیا۔ مترجم]

[2] [مصنّف کو مقطعات، نعت اور زٹلیات کی تعریف میں مغالطہ ہُوا ہے۔ عبدالحق]

باہم کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا اور جس کا جواب سائل سے پوچھنا پڑتا ہو- یہاں
میں ایک مثال سید احمد سے لے کر لکھتا ہوں -

سوال : انار کیوں نہ چکھا
سوال : وزیر کیوں نہ رکھا
جواب : دانا نہ تھا-

تین خاص خاص ہندی نظموں کے ناموں کے متعلق اپنی تاریخ میں
لکھ چکا ہوں - یہاں تھوڑا اضافہ کرنا چاہتا ہوں -

" چوپائی "، کے معنی جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہو، رُباعی کے ہیں
یعنی چار مصرعوں والی نظم - عملاً اِس کی تعداد معیّن نہیں کیونکہ چوپائیاں پانچ
کی بھی ہوتی ہیں اور نو کی بھی -

" دوہا " ایسا ہی ہو جیسے مسلمانوں میں بیت ؛ لیکن اِس کا ہر مصرع
کئی حصوں میں تقسیم ہوتا ہو جسے 'چرن' یا 'پد' کہتے ہیں -

" گن " عام نام ایسی نظموں کے لیے ہو جو لَے میں پڑھی جاتی ہیں- اور
وہ نظمیں جو موسیقی کے طرز پر باقاعدہ گائی جاتی ہیں وہ "کرتن" کہلاتی ہیں-

سید احمد لکھتے ہیں[1] کہ "مُکری" میں عورت کے مُنہ سے ایسا لفظ کہا جاتا ہو
جس کے دو معنے ہوتے ہیں اور سوال کرنے والا یہ سمجھتا ہو کہ اِس کے معنی
کچھ اور ہیں - اور اُس کی مثال یہ ہو:

سگری رین چھتین پر راکھا ؛
رنگ روپ سب واکا چاکھا ؛
بھور بھئی ، تب دِیا اُتار-
اے سکھی ، ساجن ؟ نا سکھی ، ہار-

---

[1] آثار الصنادید -

"پہیلی" میں سیّد احمد ہی کے قول کے مطابق کسی چیز کے اوصاف اور خصائص اور پتے بیان کیے جاتے ہیں اور مخاطب سے پوچھا جاتا ہی کہ وہ چیز کیا ہی۔ بڑی خوبی پہیلی کی یہ ہی کہ اُس میں اُس چیز کا نام بھی آجائے جس کے اوصاف اور خصائص بیان کیے گئے ہیں، پھر بھی مخاطب نہ سمجھے[۵۱]۔ ملک الدین، بسمل[۵۲] اور امیر خسرو اس صنف میں ممتاز ہیں۔ خسرو کی ایک پہیلی ہی:

بالا تھا، تو سب کو بھایا،
بڑا ہُوا، کچھ کام نہ آیا،
خسرو، کہ دیا اُس کا نانو؛
ارتھ کرو، نئیں چھاڈو گانو[۵۳]۔

بُوجھ: دِیا (چراغ)۔

ایک اور چیز ہی جسے "پکھانا" کہتے ہیں[۵۴]۔ یہ ایک قسم کا کبت ہی، سوال

۵۱[" آثار الصنادید" (کان پور ۱۹۰۴ع) باب ۳، ص ۱۰۷۔ ع۔ص)۔]

۵۲[محمد جواد عرف مرزا لالن "بسمل"، فیض آبادی، آصف الدولہ کے زمانے کے آدمی ہیں (دیکھو رسالۂ اُردو، ج ۱۹، ص ۵۷ اور آگے) مگر "میر" نے اپنے تذکرے میں اِن کا ذکر نہیں کیا اور قائم، گردیزی اور علی ابراہیم خاں نے بھی اِن کا نام نہیں لیا (اشپرنگر، فہرست ص ۲۱۵)؛ پہیلیاں بسمل کی بہت ہیں۔ شاہ اودھ کے توپ خانے والے کتب خانے میں اِن کی پہیلیوں کے دو مجلّد موجود تھے، ایک میں پان سو، دوسرے میں کوئی ڈھائی تین سو پہیلیاں (اشپرنگر، فہرست ص ۶۰۲ - ۶۰۳)۔ ع۔ص۔]

۵۳[اس چوپائی کے بدلے مصنف نے فرانسیسی نثر میں پہیلی یوں لکھی ہی: "وہ چیز کیا ہی جو تیلی کے تیل، کمہار کی کلھیا، ہاتھی کی سونڈھ اور نواب کی نشانی سے بنی ہی؟" خسرو کی پہیلیوں میں کوئی ایسی نہیں ملتی جس کا مضمون اِس کے قریب بھی ہو۔ اِس لیے "چراغ" کی مشہور پہیلی، جو خسرو سے منسوب ہی اور جو زرا بدلی ہوئی صورت میں "آثار الصنادید" میں بھی نقل ہوئی ہی، یہاں لکھ دی گئی۔ ع۔ص۔]

۵۴[اصل میں "پکھانا" کے آگے قوسین میں "پتھر" کا فرانسیسی مرادف لکھا ہُوا ہی؛ مگر یہ صحیح نہیں۔ ہندی میں "پتھر" کو "پاکھان" کہتے ہیں (سنسکرت: "پاشان ڑ")؛ لیکن یہاں اُس لفظ سے کچھ واسطہ نہیں۔ "پکھانا" اور ہی لفظ ہی جس کے معنی ہیں: "کہاوت، کہن، کتھا، کہانی، مَثَل"۔ اِس کی اصل ہی سنسکرت

جواب کی صورت میں، جس میں ایک عورت کا کچھ حال چند فقروں میں بتایا جاتا ہی اور اِن فقروں میں سے ہر ایک کا اہم لفظ ایک ہی حرف سے شروع ہوتا ہی، جیسے ذیل کے فقروں میں سے ہر ایک جواب الف سے شروع ہوتا ہی[1]۔

"صنم آمد - از کجا آمد؟" — "از اکبر آباد"۔

"کجا می رود؟" — "به اورنگ آباد"۔

"چه نام دارد؟" — "اِندر کُور"۔

"از چه قوم است؟" — "اہیرنی"۔

"چه می خورد؟" — "انار"۔

"چه تحفه آورد؟" — "انگور"۔

"چه می پوشد؟" — "اطلس"۔

"چه زیور دارد؟" — "انگشتری"۔

"چه می نوازد؟" — "ارغنون"۔

"کدام نغمه می سراید؟" — "اساوری"۔

! "اُپاکھیانَ"، اِس لفظ کا پہلا ٹکڑا "اُپ" ہی، جس کے معنی ہیں: "کا ایسا، مانند"، جیسے "اُپ کتھا": وہ چیز جو کتھا کی سی ہو۔ اِس طرح "پکھان" کے معنی ہیں: "وہ کہن جو کتھا یا کہانی کی سی ہو"۔ ع - ص -]

[1] یہ ملک الدین مصنف "بشاشۃ الکلام" کا بیان ہی - دیکھو اوزلے کی "نوٹس آف پرشین پوئٹس"، ص ۲۴۴ - [اوزلے نے کتاب کا نام "بشاشۃ الکلّم" لکھا ہی؛ صحیح "بشاشۃ الکلِم" ہی - گارساں دتاسی نے اِس چیز کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھا نہیں - اور جو عورت کی تخصیص کردی ہی، یہ بھی صحیح نہیں - اصل میں یہ ایک کھیل ہی جو آج سے چالیس پینتالیس برس پہلے تک بچوں کی دل چسپی کا ذریعہ تھا اور فارسی ہی میں ہوتا تھا - جہاں تک مجھے معلوم ہی کھیل کا نام عام طور پر "صنم آمد" ہی تھا - البتہ اوزلے کی تحریر سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ ہندی میں بھی منتقل ہوگیا تھا اور ظاہرا "پکھانا" کا لفظ ہندی تک محدود رہا - یہاں صرف الف کی مثال دی گئی ہی - اِسی طرح اگر جواب دینے والے نے پہلے جواب میں ب یا کسی اور حرف سے شروع ہونے والے شہر کا نام لے دیا تو پھر یہ لازم ہوجاتا تھا کہ ہر جواب کا کلمہ اُسی حرف سے شروع ہو - اِس سے بچوں کو بہت سے شہروں اور قوموں اور چیزوں کے نام معلوم کرنے اور یاد رکھنے کی فکر ہوجاتی تھی - یہ اور اور بہت سے کھیل تماشے ہماری بیرون نصابی تعلیم کے ذریعے تھے جواب خواب و خیال ہوگئے - ع - ص -]

میں نہیں جانتا کہ کوک شاستر کو تصانیف کی کس صنف میں رکھوں۔ یہ کتابیں حد درجے کی عیاشانہ نظمیں ہیں جن میں شہوت انگیز اعمال کی تشریح و تجزیہ ہوتا ہے اور عورتوں کی اخلاقی اور جسمانی تقسیم اُن کے صفات و احساسات اور دلربائیوں کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ مردوں کی تقسیم بھی اِسی قسم کی ہوتی ہے۔ دکن کا علی حسن اور شہاب الدین اور موتی رام اس قسم کے خاص ہندوستانی مصنّف ہیں جنھوں نے اِن مضامین پر کتابیں لکھی ہیں۔

طویل مثنویاں خاص مضامین پر ہوتی ہیں۔ مثلاً کوئی تاریخی منظر یا بعض اوقات پوری تاریخ، اکثر کم و بیش تاریخی یا خیالی فسانے ہوتے ہیں، لیکن عام طور پر عام پسند قصوں کو شاعر اپنے مذاق کے مطابق گھڑ کر بیان کرتا ہے۔ ایسے کئی ہندوستانی، ایرانی اور ترکی شاعر ہیں جنھوں نے پانچ پانچ سات سات ایسے قصے نظم کیے ہیں۔ یہیں سے خمسے اور ہفتے کی بنیاد پڑی جو گویا بڑی بڑی مثنویوں کے دیوان ہیں۔ زیادہ تر مشہور نظامی اور خسرو کے خمسے اور جامی کا "ہفتہ" ہے، جو استعارۃً "ہفت اورنگ" کے نام سے معروف ہے۔

اِس قسم کے ادب کا جُزِ اعظم مقبول اور عام پسند قصے ہیں۔ یہ قصے مشرق کے مشہور عاشقوں کے فسانے ہیں، مثلاً یوسف و زلیخا، فرہاد و شیریں، مجنون و لیلیٰ، وامق و عذرا۔

علاوہ اِس کے بڑے بڑے بہادروں کے قصے ہیں جو ایک قسم کے فسانے بن گئے ہیں، مثلاً سکندر، رستم، حمزہ، حاتم طائی، بہرام گور (یہ نام گورخر کے شکار کے شوق میں پڑ گیا)۔

ہندوستانی زبان میں اِن مسلمانی قصوں کو خوب خوب بیان کیا ہے اور اِن میں مقامی رنگ بھی پیدا کر دیا ہے جس سے اِن کی خوبی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

بہت سے ایسے قصوں کو اُن کے مصنفوں نے ترجمے سے تعبیر کیا ہی، لیکن یہ ایک قسم کا طرزبیان ہی جس کا مفہوم یہ ہی کہ اِن کی بنیاد اُن فارسی کتابوں پر ہی جو شہرت عام حاصل کرچکی ہیں - یہ پہلے بیان ہوچکا ہی کہ ہندوستانی کے رواج سے قبل خود ہندو ایک زمانے تک فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے تھے - اُس وقت بھی شروع شروع میں اس عام اور مشترک زبان (فارسی) میں لکھنے پر وہ معذرت سی کرتے اور اپنی تالیفات کو فارسی تصنیفات سے منسوب کیا کرتے تھے - لیکن اِن اِدعائی ترجموں کو ذرا غور سے دیکھنے کی زحمت گوارا کی جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ ترجمے تو کیا اُنھوں نے تقلید بھی نہیں کی بلکہ وہ جدا کتابیں ہیں، قصہ تو وہی ہی مگر مضمون اور صورت بالکل الگ ہی -

قطع نظر قصوں کے سنجیدہ تالیفات کا بھی یہی حال ہی - مثلاً "آرایش محفل" جو سجان رائے کی فارسی تصنیف خلاصۃ التواریخ کی اُردو نقل سمجھی جاتی ہی اور جس میں ہندوستان کی تاریخ و مقامات کا ذکر ہی، درحقیقت فارسی کتاب کے مضامین کو ایک دوسری صورت میں پیش کیا ہی -

میں "یوسف زلیخا" کے چھ مختلف نسخوں سے واقف ہوں - ایک "امین[1]" کا جو ۱۶۰۰ع میں لکھا گیا[2] - دوسرا "طپش"، کا جو اُس نے بزمانۂ قید قید خانے میں لکھا[3] - تیسرا "فدوی"، لاہوری کا، جس پر اُس کے ایک

---

[1] اس کا ایک باب میں نے اپنی کتاب "ہندوستانی کے مبادی" میں نقل کیا ہی اور بعض اجزا کا ترجمہ اپنی تاریخ میں دیا ہی -

[2] [یہ سنہ غلط ہی - بزم نامۂ عالمگیر ۱۱۰۹ھ (۱۶۹۷ع) میں تصنیف ہوئی - عبدالحق]

[3] دیکھو تذکرۂ قاسم - دیکھو میری کتاب تاریخ ادبیات جلد اول صفحہ ۵۰۲ [قاسم نے طپش کے

ہم عصر نے بہت کچھ نکتہ چینی کی ہے[1]۔ چوتھا "مجیب" کا جو اِس زمانے کا شاعر ہے۔ پانچواں "عاشق" (مہدی علی) کا جو "عشق نامہ" کے نام سے موسوم ہے اور ۱۸۴۷ء میں بمبئی میں طبع ہوا۔

"لیلیٰ مجنوں" کی پانچ مختلف مثنویوں کا مجھے علم ہے۔ "تجلی" کی[2] "عظیم" دہلوی (معروف بہ شاہ جھولن) کی، جو شاہنامے کی بحر میں ہے، "ہوس" کی جو اودھ کے ایک نواب آفاق الدولہ کے رشتہ دار ہیں اور "رضا"، "رضی"، اور "رسا" کے ناموں سے مشہور ہیں، "ولا" کی جو امیر خسرو کی مشہور فارسی مثنوی کی تقلید میں لکھی گئی ہے اور ایک اور قدیم نسخہ جس کا ذکر ڈاکٹر اشپرنگر نے کیا ہے[3]۔

ہندوستانی میں بہرام گور کے تین نسخوں سے میں واقف ہوں ایک حیدری کا جس کا نام "ہفت پیکر" ہے، جو نظامی کی مثنوی کا نام ہے، دوسرا "طبعی" (ساکن گولکنڈہ) کا، جو ۱۰۸۱ھ (۱۶۷۱-۱۶۷۰ء) میں لکھا گیا، تیسرا "حقیقت" بریلوی کا، جس کا سال تصنیف ۱۲۲۵ھ (۱۱-۱۸۱۰ء) اور نام "ہشت گلزار" ہے۔ غالباً یہ نام آٹھویں آسمان کی مناسبت سے رکھا گیا ہے ورنہ نظامی کی "ہفت پیکر" اور ہاتفی کی "ہفت منظر" کی مناسبت سے "ہفت گلزار" ہونا چاہیے تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ایران کے بادشاہ بہرام گور

ترجمے کا ذکر نہیں کیا، مصنف کو دھوکا ہوا ہے۔ طپش نے بہار دانش کا ترجمہ کیا ہے۔ طپش کا قید ہونا کسی تذکرے میں نہیں پایا جاتا (م ح)]

[1] یہ نکتہ چیں میر فتح علی (شیدا) ہے۔ اِس کی نظم "قصۂ بوم و بقال" میں فدوی کے باپ کے پیشے کی طرف اشارہ ہے۔ دیکھو میری تاریخ جلد ا صفحہ ۱۷۵۔

[2] دیکھو میری تاریخ (جلد اول) میں اِس کا احوال۔

[3] دیکھو اُن کی فہرست، دیوان ہوس کا ذکر جلد اول صفحہ ۶۱۲۔

پسر یزدجرد کا قصّہ ہی جس کے سات بیویاں تھیں جو سات باغوں میں الگ الگ رہتی تھیں۔

ہندوستانی میں اسکندر کے قصے کے متعلق مجھے صرف دو مثنویوں کا علم ہی، ایک آگرے کے "اعظم" کی، جو اِس زمانے کا شاعر ہی، دوسری "نکہت" دہلوی کی جو اُس کتاب کی پیروی میں لکھی گئی ہی۔

حاتم کے قصے بھی ہندوستانی اور فارسی میں بہت عام اور مشہور ہیں۔ حیدری، سراج اور گوپی ناتھ نے اِن قصوں کو لکھا ہی۔ "دو شاہ و درویش" کا قصہ بھی ہندوستانی، فارسی اور ترکی میں کئی مصنّفوں نے لکھا ہی "جہان" (بینی نراین) کا لکھا ہوا سب سے زیادہ مشہور ہی۔

بعض اور بھی فسانے ہیں جن کا تعلق امیر حمزہ کی داستان سے ہی۔ ایک تو اشک کی تالیف ہی جس کا تفصیلی ذکر میں نے اپنی تاریخ ادبیات میں کیا ہی اور دوسری غالب لکھنوی کی۔ سُنا ہی کہ اس کا ترجمہ فارسی میں ہوا اور کلکتے میں چھپا ہی۔

حنیف یا بن حنیفہ[لے] (فرزند حضرت علی) کے قصے بھی بعض لوگوں نے لکھے ہیں ہر مصنف نے اپنے مذاق کے مطابق اِسے بڑھایا گھٹایا ہی۔ تین نسخوں کا، جن کے نام بھی مختلف ہیں، مجھے علم ہی۔ یعنی آزاد، سیوک اور واحدی کے۔

مشرق میں جو نامور لوگ ہوئے ہیں اور جن کی نسبت قصے اور فسانے مشہور ہو گئے ہیں اُن میں سے میں ایک اور کا ذکر کروں گا۔ یہ "ایران کے بادشاہ شاپور کے بیٹے ہرمز کی تاریخ" ہی۔ یہ وہی بادشاہ ہی جس نے مانی کے عقائد کی

لے اِن کا ذکر دیکھو ابن خلکان میں (مترجمہ اسلین جلد ۲، صفحہ ۵۷۴)

[صحیح "حَنَفِیّہ"۔ حضرت محمد ابن حَنَفیّہ مراد ہیں۔ ع۔ ص]

اشاعت میں مدد دی - اہلِ مشرق کے خیال کے مطابق مانی بہت بڑا مصوّر اور شعبدہ باز تھا[1]-

لیکن علاوہ اُن قصوں کے جو تمام اسلامی ممالک میں عام اور مشترک ہیں، ہندوستانی کے شاعروں نے ہندی قصوں کو بھی جو ملک والوں میں مقبول ہیں، نہیں چھوڑا - مثلاً شکنتلا کا دردناک قصہ، جو نہ صرف شکنتلا ناٹک کی پیروی میں بلکہ مہا بھارت کے بیان کے مطابق بھی ہندوستانی زبان میں تالیف کیا گیا ہے، میں نے اِس قصے کو ہندی سے ترجمہ کیا ہے[2]- جہاں تک مجھے معلوم ہے اس پر ہندوستانی میں چار مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں - ایک نواز کی جسے سلطان فرخ سیر نے کبیشور (ملک الشعرا) کا خطاب عطا فرمایا[3]، دوسری جوان (کاظم علی) کی جس کا نام شکنتلا ناٹک ہے اور جو کلکتے میں ۱۸۰۱ء میں چھپی - ڈاکٹر گلکرسٹ نے جو طریقہ رومن حروف میں لکھنے کا اختراع کیا تھا یہ کتاب اُنھیں حروف میں طبع ہوئی ہے - تیسری غلام احمد کی جس کا نام "فراموش یاد" ہے - یہ کلکتے میں ۱۸۴۹ء میں چھپی، اِس کا خلاصہ ژورنال آسیاتیک[4] میں بھی دیا گیا تھا - چوتھی ایک پارسی مصنف کی[5]-

اِسی قسم کا قصہ پدماوت کا ہے، جو ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی مشہور

---

۱ [حقیقت میں مانی ایک مذہب کا بانی تھا جس سے زردشتی مذہب کی اِصلاح مقصود تھی - شاپور کی تخت نشینی کے دن مانی نے اپنے نئے مذہب کا اعلان کیا - شاپور کے بیٹے ہرمزد نے اُس کی مدد کی مگر بعد کو مانی کی بہت مخالفت ہوئی - ع - ص]

۲ اورینٹل ریویو ۱۸۵۲ء -

۳ دیکھو میری تاریخ ادبیات جلد اوّل صفحہ ۲۰۹ -

۴ شانوبین برتراند کا مضمون، جلد بابت ۱۸۵۰ء -

۵ بومن جی دوساب جی، جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے -

رانی ہوئی ہی۔ وہ لنکا کے ایک بادشاہ کی بیٹی تھی اور اُس کی شادی چتوڑ کے راجہ رتن سے ہوئی تھی جسے علاءالدین نے ۱۳۰۳ء میں مغلوب و مفتوح کیا۔ جائسی کے قول کے مطابق (جس نے اِس قصے کو نظم کیا ہی) وہ اپنی رضا و رغبت سے کئی ہزار عورتوں کے ساتھ چتا میں جل کر مرگئی تاکہ فاتح کے ہاتھوں اُسے ذلّت دیکھنی نصیب نہ ہو۔ جٹ مل نے اِسی قصے کو ہندی میں لکھا ہی، لیکن وہ اس قصے کو دوسری ہی طرح بیان کرتا ہی۔ وہ لکھتا ہی کہ پدماوت چتا میں جل کر نہیں مری بلکہ وہ مسلمان فوج کے سپہ سالار کو جُل دے کر نو پالکیوں کے ساتھ، ٹرائے کے گھوڑے کی طرح، اُن کے لشکرگاہ میں داخل ہوتی ہی۔ اِن پالکیوں میں راجپوت سپاہی بھرے ہوئے تھے جو اچانک نہتے مسلمانوں پر جا پڑے اور اُن کا خاتمہ کر دیا۔

عشرت اور عبرت دو شاعر ہوئے ہیں جنھوں نے ہندوستانی میں اِس بہادر راجپوت رانی کے قصے کو نظم کیا ہی۔[لے]

کرشن کی دلچسپ تاریخ پر ہندوستانی میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، سب سے بہتر لالچ کی ہی جو فرانسیسی میں ترجمہ ہوگئی ہی، بھوپتی اور کرشن داس نے بھی اِس مضمون پر بڑی اچھی نظمیں لکھی ہیں، لیکن سب سے بڑھ کر پریم ساگر ہی جو ہندی ادب میں بڑا پایہ رکھتی ہی۔ اِس کتاب کے متن میں جگہ جگہ نظم بھی آتی ہی جس میں پرانے لفظ استعمال کیے گئے ہیں، اِس کتاب کی نثر اور نظم میں عجیب تضاد نظر آتا ہی۔

رام چندر جی کی تاریخ صرف والمیکی نے سنسکرت ہی میں نہیں لکھی بلکہ

لے مصنف کے لفظوں سے مفہوم ہوتا ہی کہ اِن دونوں نے دو الگ الگ نظمیں لکھی ہیں، حالانکہ نظم ایک ہی اور لکھنے والے دو ہیں "تصنیف دو شاعر" سے اِس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۱ھ نکلتا ہی۔ عبدالحق۔

بہت سے شاعروں نے ہندی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اُن میں سے ایک تلسی داس ہیں، جن کی نظم اگرچہ ۱۵۸۰ء سے قبل لکھی گئی ہے لیکن اب بھی وہ اہل ہند میں والمیکی سے زیادہ مقبول ہے۔ کیشوداس نے "رام چند ریکا"، تالیف کی ہے، یہ دوسری رامائن ہے جس کی شرح جھگن لال نے لکھی ہے۔ سورج چند اور بہت سے اور ہندی شاعروں نے اِس باعظمت ہستی کی مدح میں اپنا اپنا کمال دکھایا ہے، جسے گورے سیو کی تصنیف اور موسیو فوش کے ترجمے نے یورپ میں روشناس کیا ہے۔

یہ وہ قصے ہیں جن میں تخیل نے تاریخ سے مل کر اپنی صنعت دکھائی ہے۔ اِن کے بعد ایسے قصے آتے ہیں جن کی بنیاد محض تخیل پر ہے۔ میرے خیال میں کامروپ کا قصہ بھی اِسی تحت میں آتا ہے۔ یہ عجیب قصہ ہے اور ہندوستانی نظم و نثر میں بہت سے مصنّفوں نے اِسے لکھا ہے۔ نظم میں تحسین الدین، ضیغم، آرزو، حسن اور سراج نے طبع آزمائی کی ہے؛ نثر میں کندن لال کی کتاب ہے جس کا نام 'دستورِ ہمت' یا 'ہمت' ہے، چونکہ یہ فارسی مصنف ہمت نامی کی تالیف کی پیروی میں لکھی گئی ہے اِس لیے یہ نام رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ سندباد کا قصہ جو الف لیلہ میں ہے اور پیس براں دیں کا قصہ جو ماری دَ فرانس کی تالیف ہے اُن کی اصل یہی ہے۔ ہندوستان کے فرضی خیالی قصے یہ ہیں: نل دمن، ہندوستانی میں جو اِس پر بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں، اُنھیں یورپ میں کوئی نہیں جانتا بلکہ وہاں مہا بھارت کی وجہ سے مشہور ہوا ہے۔ سب سے مشہور ہندی کے نامور شاعر سورداس کی نظم ہے۔ آخر میں میر علی بنگالی کی تالیف ہے جس کا نام "بہارِ عشق" ہے اور دوسری احمد علی کی جو حال میں لکھنؤ میں چھپی ہے۔

گل بکاولی کا قصہ بہت ہی دِل فریب ہے۔ اُس میں ہندی تعلیم و عقائد کو

قرآن کی تعلیم میں سمویا ہے۔ یہ ہندوستان کے جدید ادب کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ اِس قصے کو ایک تو نہال چند نے لکھا ہے جس میں نثر اور نظم ملی ہوئی ہے۔ نسیم نے اُسے گلزار نسیم کے نام سے منظوم کیا ہے۔ یہ نسیم آگرہ کالج میں پروفیسر تھے[۱]۔ ایک دوسرے شاعر نے "تحفۂ مجلس سلاطین" کے تاریخی نام سے نظم کیا جس سے ۱۱۵۱ھ (۳۹-۱۷۳۸ع) نکلتا ہے[۲]۔ ریحان کی نظم کا نام "خیابان ریحان" ہے۔ یہ نظم دوسری نظموں سے زیادہ طویل ہے۔ اِس میں چالیس باب ہیں اور ہر باب کو وہ "گلشن" سے موسوم کرتا ہے۔ ڈاکٹر اشپرنگر[۳] کو دکھنی زبان کا ایک نسخہ بھی کتاب خانۂ توپ خانہ لکھنؤ میں دستیاب ہوا تھا۔ جو ۱۰۳۵ھ (۲۶-۱۶۲۵ع) کا لکھا ہوا تھا۔

"ہیر رانجھا" پنجابی قصہ ہے۔ مقبول نے جو اِس زمانے کا شاعر ہے، مخلوط فارسی اُردو نظم و نثر میں لکھا ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ کیا ہے[۴]۔ اِسی نام کا ایک اور شاعر بھی ہے، یہ اُس سے الگ ہے۔

"سسّی پنّوں" کے عشق کا قصہ ہیر اور رانجھے کی طرح مقبول نے نثر میں لکھا ہے اور محبت نے نظم میں اور ہندو[۵] مؤلفین نے فارسی میں۔

پھول بن اور اُس کے عاشق طالع شاہ کا قصہ بہت سے دکھنی شاعروں نے لکھا ہے۔ عوری (ابن نشاطی)[۶] کی مثنوی زیادہ مشہور ہے جس کا علم ہمیں

---

[۱] [یہ غلط ہے۔ (عبدالحق]

[۲] [اس نام سے یہ سنہ نہیں نکلتا۔ اِس میں کچھ غلطی ہوگئی ہے۔ (عبدالحق]

[۳] ڈاکٹر اشپرنگر فہرست صفحہ ۶۳۲۔

[۴] ریویو ڈا اورنیٹ اے ڈالجیری ۱۱ ستمبر ۱۸۰۷ع۔

[۵] اندرجیت منشی، جونت پرکاش وغیرہ۔

[۶] [ابن نشاطی کا دوسرا نام عوری نہیں، گزشتہ اوراق میں دو ایک جگہ ہم نے اِس کو واضح کیا ہے (ح)]

محمد ابراہیم مترجم انوار سہیلی سے ہُوا ہی۔

"گل و صنوبر" میں اِس عجیب قصے کے چھ مختلف نسخوں سے واقف ہوں ؛ ایک احمد علی کا جو اُس کے خمسے کلہ جز ہی ؛ دوسرا نیم چند[1] کائستھ کا ؛ تیسرے کا نام "گلشن ہند" ہی؛ چوتھا دکنی میں جس کا ایک نسخہ نظام[2] کے کتب خانے میں ہی ؛ پانچواں، جو ۱۸۴۵ء میں لکھنؤ میں طبع ہُوا، اور چھٹی دفعہ کلکتے میں سنہ ۱۸۴۷ء میں، جو فارسی[3] کا ترجمہ ہی۔

"قصۂ چہار درویش" ایک تو امّن کا ہی جس کا نام "باغ و بہار" ہی، (یہ تاریخی نام ہی) اور سول ملٹری عہدہ داروں کے نصاب امتحان میں داخل ہی۔ اِس پر کئی مصنفوں نے طبع آزمائی کی ہی، منجملہ اُن کے ایک "تحسین" (عطا حسین) ہی، جس کی کتاب کا نام "نوطرزِ مرصّع" ہی۔

"گرو پرم ارتھم" کا فسانہ تامل میں زیادہ تر مشہور ہی مگر ہندوستانی میں بھی پایا جاتا ہی جو مدراس میں ۱۸۴۸ء میں طبع ہُوا۔

"بیتال پچیسی" اور "سنگھاسن بتیسی"۔ یہ دو مشہور قصے کی کتابیں ہیں۔ دھرم نرائن، للو، سورت اور دوسرے بہت سے ہندی مصنّفوں نے اِس پر طبع آزمائی کی ہی۔

"توتا کہانی" کے متعلق میں صرف اپنی یاد سے لکھتا ہوں۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہی۔ اور ہندی، اُردو اور دکھنی میں کوئی آٹھ مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں جن کا علم مجھے ہی۔ یہاں میں اُن کے صرف نام گنوائے دیتا ہوں :۔

---

[1] نیم چند کی کتاب کا ترجمہ میں نے اورنٹیل ریویو امریکہ میں شائع کیا ہی۔

[2] دیکھو میری تاریخ ادبیات ہندوستانی صفحہ ۴۳۔

[3] ممکن ہی کہ یہ نیم چند ہی کی کتاب ہو۔

خاور شاہ[1] "لعل و گوہر" اور "جذبِ عشق"، جس کا میں نے ملخص ترجمہ کیا ہے[2] اور "مہر و ماہ" اور "ماہ منور" جس کا متن میں نے شائع کیا[3]۔

علاوہ اِن منظوم فسانوں کے جو مقبول عام قصوں سے لیے گئے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کے ہیرو غیر معروف ہیں۔ ہندوستانی میں ایسے قصے بہ کثرت ہیں اور اکثر مشہور ہیں۔ جن میں سے چند کا ذکر کرتا ہوں:۔ "قصۂ بلند اختر" جو میر خاں نے لکھا ہے؛ "رضوان شاہ"، جس کے دو نسخوں سے میں واقف ہوں، "چندر بدن اور مہیار" جس کے کئی نسخوں کا مجھے علم ہے[4]، "دلارام اور دلربا" جس کے مؤلفوں میں ایک متی رام ہے؛ "پری رُخ و ماہ سیما"، جس پر وجیہ نے ایک مثنوی لکھی ہے؛ "فسانۂ عجائب" جو سرور کانپوری کی تصنیف ہے اور جو ویسا ہی مقبول ہے جیسا کہ "قصۂ چہار درویش"۔

اِس قسم کے قصوں کا مزید ذکر باعث طوالت ہوگا۔ اِن کی کیفیت اُن ترجموں اور خلاصوں سے معلوم ہو سکتی ہے جو میں نے بعض قصوں کے کیے ہیں۔ عام طور پر پہلے ہیرو اور ہیروئن کا جسمانی اور اخلاقی حال تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ اُس کے بعد کم و بیش عجیب و غریب یا پیچ در پیچ واقعات کا ذکر ہوتا ہے جو اُن کو پیش آتے ہیں اور جو ہمیشہ اُن کی ملاقات کے مانع اور حارج ہوتے ہیں۔ آخر میں

---

[1] علاوہ عاشق کی تالیف کے ایک رسمی کی بھی ہے جس کا نہایت عمدہ نسخہ نسخ میں ایسٹ انڈیا ہاؤس کے کتاب خانے میں ہے۔ یہ نسخہ بہت سے نادر رنگین نقش و نگار سے مزین ہے۔ [رستمی کو مصنف غلطی سے رسمی اور اُس کی مشہور کتاب خاورنامہ کو خاور شاہ لکھتے ہیں۔ (چ)]

[2] دیکھو میری تاریخ ادبیات جلد اول ص ۵۷۳۔

[3] علاوہ اخی کے نسخے کے جو میرے درسی انتخاب ہندستانی (اُردو اور دکنی) میں شائع ہو چکا ہے، صالح کا نسخہ اُس سے زیادہ قدیم ہے، جس کی کتابت ۱۲۳۳ھ (۱۲۰ - ۱۸۲۱) میں ہوئی تھی۔

[4] دیکھو میری تاریخ ادبیات جلد دوم صفحات ۵۳۲ وغیرہ۔

اُن کی محبت اور وفاداری کا صلہ ملتا ہے۔ بعض اوقات مگر شاذ و نادر انجام المناک بھی ہوتا ہے جیسا میر کی مثنوی "شعلۂ شوق"، یا "دریائے عشق" میں یا مجروح کی مثنوی "اعجازِ عشق" یا اخی کی مثنوی "مہر و ماہ" میں ہوا ہے۔

ہندوستان میں نظم کی ایک اور قسم بھی ہے جو بہت عام ہے۔ اِس میں قدرت کے مناظر کا جو مختلف موسموں یا مختلف مہینوں میں نظر آتے ہیں، بیان ہوتا ہے۔ اِس قسم کی نظموں کو "بارہ ماسا" کہتے ہیں۔ اِن میں بعض وقت فطرت کے موسموں کا سادہ بیان ہوتا ہے اور کبھی ناٹک کی طرز پر۔ مثلاً فرض کرو ایک عورت ہے جس کا خاوند سال بھر سے باہر ہے جو موسموں کی تبدیلیوں کے بیان کے ساتھ اپنی تنہائی اور فراق کا دُکھڑا بھی ملا دیتی ہے۔ یہ دلکش بیان جو عورت ہر مہینے اپنے خاوند کو بھیجتی ہے آسانی سے خیال میں آسکتا ہے[1]۔ بعض شعرا نے صرف عجائبات قدرت ہی پر نہیں لکھا بلکہ اِس قسم کی نظموں میں ہندوستان کے مذہبی اور معاشرتی تہواروں کو بھی نظم کیا ہے، لیکن ان میں اکثر ہندوؤں کے تیوہار زیادہ ہوتے ہیں۔ اِس قسم کی بہت سی نظمیں ہیں جن کا میں نے ذکر بھی کیا ہے[2]۔

اِن کے علاوہ اور بھی خاص قسم کی نظمیں ہوتی ہیں مثلاً ایک نظم ہندوستان کے پھولوں کے بیان میں ہے جس کا نام "پھول چرتر" ہے۔ مسلمانوں کے ادب میں تصنیف کی ایک اور خاص قسم ہوتی ہے جو ہمارے قصے کے مماثل نہیں بلکہ قصوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک ہی قصے میں بہت سے قصے ملے ہوتے ہیں۔ یہ ایک عجیب قسم کی تصنیف ہوتی ہے اور اس میں اخلاقی اور

---

[1] دیکھو "ژورنال آسیاتیک" ۱۸۵۰ء۔

[2] منجملہ اوروں کے جوان کا بارہ ماسا ہے، دیکھو میری تاریخ جلد ۲ - ص ۳، ۴۔

بعض اوقات حکیمانہ اور مذہبی شان پائی جاتی ہے۔ مثلاً "کشف الاسرار"[۱]، "منطق الطیر"[۲]، "اخوان الصفا" وغیرہ جو بہت مشہور ہیں۔ "اخوان الصفا" اکرام علی کے پاکیزہ ترجمے کی وجہ سے ہندوستان میں بہت مقبول ہے۔ اِس میں جانور باری باری سے اپنے اپنے صفات بیان کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ خداوند تعالیٰ ہمیں اکثر جانوروں میں ایسی صفات کے نمونے دکھاتا ہے جو انسان کے لیے قابل تقلید ہوتی ہیں۔ (انگریز مصنف) "گے" جس نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں، اِسی مضمون کو ایک نظم میں اِس طرح بیان کرتا ہے :-

"شہد کی مکھی کی شب و روز کی محنت میری روح کو محنت کی طرف مائل کرتی ہے۔ کون ہے جو محتاط چیونٹی کو دیکھے اور آئندہ کی اِحتیاج کی فکر نہ کرے؟ میرا کُتّا جو نہایت قابلِ اِعتبار اور وفادار ہے میرے دل میں اِحسان مندی کی آگ مشتعل کرتا ہے۔

---

[۱] مَقدسی کی تصنیف، جو "الطیور والازھار" کے نام سے شائع ہوئی۔ [اِس کتاب کے عربی متن کو خود گارساں دتاسی نے ایڈٹ کر کے ۱۸۲۱ء میں پاریس سے شائع کیا تھا۔ ایک جرمانی مستشرق پاپُر نے اِس کا ترجمہ جرمانی زبان میں کیا جو ۱۸۵۰ء میں چھپا۔ مصنف کا پورا نام ہے: عزّالدین عبد السلام بن احمد بن غانم المقدسی۔ ۶۷۸ھ کے قریب وفات پائی۔ کتاب کا نام ہے "کشفُ الاسرار عن الحِکَمِ المُودَعَۃ فی الطیورِ والازھارِ"، مضمون کتاب کا متصوفانہ ہے جیساکہ عطّار کی "منطق الطیر"، کا۔ "منطق الطیر" کو بھی گارساں دتاسی ہی نے یورپ سے روشناس کیا۔ ۱۸۵۷ء میں فارسی متن مع فرانسیسی ترجمے کے شائع کیا اور پھر ۱۸۶۳ء میں دوبارہ چھپوایا۔ ع-ص]

[۲] میں نے یہاں اس کتاب کے مجازی حصے سے بحث نہیں کی۔ اِس کے لیے دیکھو Notices et Extraits des Manuscrits جلد ۹ صفحہ ۳۹۷ اور Le Journal des Savants ۱۸۱۷ء صفحہ ۶۸۵ اور "جورنل ایشیاٹک سوسائٹی" جون اور اگست ۱۸۴۸ء۔

میں فاختہ سے وفاداری اور زن و شو کا ہر محبت کا سبق سیکھتا ہوں۔
ہر ایک پرند جو ہوا میں آزادی سے اُڑتا ہی مجھے والدین کی نگرانی کا
سبق دیتا ہی"۔

اِس قسم کی تالیفات میں سب سے مشہور "پنچ تنتر" (یعنی پانچ باب) ہی۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہی اور ہندوستانی میں بھی ترجمہ ہوگئی ہی۔ اِس کے بہت سے قصے یورپ کی تمام زبانوں میں مختلف صورتوں میں پہنچ گئے ہیں اور ہمارے ملک (فرانس) میں زندۂ جاوید لافوں تین (La Fontaine) کی بدولت اِس کے اصل مضامین بہت ہی مقبول ہوئے ہیں۔

ہندوستانیوں میں اب تک ناٹک کا وہی ذوق موجود ہی جو اُن کے بزرگوں میں تھا؛ لیکن صرف بڑے ہی بڑے موقعوں پر اس کا اظہار ہوتا ہی۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوتا ہی کہ کلکتے کے ایک متمول مسلمان کے گھر میں یوسف و زلیخا کا ڈراما ہوا[1]۔ محرم کے ایام عشرہ میں بھی امام حسین کے ماتم میں تعزیے کی صورت میں اِن اسرار کا اظہار کیا جاتا ہی۔ اِن اسرار میں خاص خاص آنحضرت صلعم اور امام حسن کی وفات اور سب سے بڑھ کر امام حسین کی شہادت ہی۔ ہندوؤں میں ہولی کے دنوں میں طرح طرح کے سوانگ بھرے جاتے ہیں۔ اِن میں وہ فی البدیہہ بھی کچھ کچھ کہتے ہیں، لیکن عموماً اِس میں بہت بد مذاقی اور فحش پایا جاتا ہی۔ پھر بھی بعض اوقات وہی مضامین بیان کیے جاتے ہیں جو قدیم سنسکرت کے ناٹکوں میں ہیں۔ "راگ ساگر" میں اِس قسم کے ناٹکوں کی مثال میں ہنومان ناٹک کا نام دیا ہی۔ یہ ایک سنسکرت کے ناٹک کی نقل ہی جس کا ترجمہ ولسن نے کیا ہی۔

---

[1] اے گروٹ صاحب صدر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا خانگی خط۔

میں معقول وجوہ کے ساتھ اوپر بیان کرچکا ہوں کہ "تذکرہ" مشرق کے مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ اِسی قسم کی ایک دوسری چیز ہے جس کا نام "انشا" ہے۔ یہ خطوط کا مجموعہ ہوتا ہے جو کسی ایک ہی شخص کی تصنیف ہوتے ہیں۔ یہ گویا فصاحت و بلاغت سکھانے کی کتاب ہوتی ہے۔ مشہور ہندوستانی زبان کی انشائیں یہ ہیں :۔

"اِنشاے فیض"[1]، فیض، شیخ فریدالدین عطار کے پندنامے کا مترجم بھی ہے؛ "خالق" (کرامت اللہ) کی؛ نظام الدین (پونے والے) کی، یہ حکایات لقمان کا بھی مترجم ہے؛ چرنجی لال کی "انشاے اُردو" (جو آگرے میں چھپی) ؛ نظام الدین اور یہ اِسی زمانے کے شخص ہیں؛ یوسف دکھنی کی، اِس (لفظ دکھنی) سے ظاہر ہے کہ یہ دکن کا رہنے والا ہے؛ انشاے ہرکرن جو فارسی میں ہے اور بہت مقبول اور مشہور ہے، اس کا ترجمہ ہندوستانی میں کیا گیا ہے۔

اب میں اُن چند کتابوں کا ذکر کرتا ہوں جو لسانیات کے متعلق ہیں۔ اِس مضمون پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن کے مطالعے سے ایشیا کی قدیم اور علمی زبانوں کے طالب علم بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔ اُردو میں اس قسم کی کتابوں میں سے ایک سنسکرت زبان کی صرف و نحو پر ہے۔ جس کا نام "مفتاح اللغت" ہے۔ یہ اصل سنسکرت کتاب "لگھو کاؤمدی" کا ترجمہ ہے جو ۱۸۴۹ء میں بنارس میں شائع ہوئی "مصدر الافاضل"[2] جو فارسی عربی کی لغت ہے ہندوستانی میں ترجمہ ہوگئی ہے، اس کا ایک اور عربی فارسی لغت کا ترجمہ "لغت اُردو" کے نام سے ہوا ہے۔ "مصدر فیوض" فارسی صرف و نحو ہندوستانی زبان میں ہے جس کے مؤلف مظہرالدین ہیں۔ "میزان فارسی" اُردو میں فارسی عروض کی کتاب ہے "مظہر نحو"

---

[1] کان پور میں ۱۸۵۰ء میں چھپی۔ [2] ["مدار الافاضل" (؟) ع۔ ص۔]

عربی نحو کی کتاب ہی جو اُردو میں تالیف کی گئی ہی۔ ایک اور اُردو الفاظ کی
لغت طبع ہوئی ہی جس میں شعرا کے کلام سے سند کے لیے اشعار نقل کیے گئے
ہیں ۔"لغت السعید" بھی اُردو کی لغت ہی۔ ایک اور اُردو کی لغت آگرے میں
۱۸۵۰ء میں طبع ہوئی ہی۔ اُردو صرف و نحو پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں
سے ایک صہبائی کی ہی، جن کی اور تالیفات بھی زبان دانی اور زبان پر ہیں۔
"بھاشا پنگل" ہندی عروض کی کتاب ہی، جس کے کئی اڈیشن چھپ چکے ہیں۔

انگریزی صرف و نحو پر بھی ہندوستانی میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اِن میں
رام کرشن کی کتاب زیادہ مشہور ہی۔

تاریخ، جس کا وجود سنسکرت میں نہیں ہی، کہیں کہیں فسانے کے ضمن میں
آجاتی ہی، لیکن ہندوستان کی جدید ادبیات میں یہ فن پایا جاتا ہی گو کہ کم۔ البتہ
یہ صحیح ہی کہ بعض منظوم ہندی روایتوں اور قصوں میں ایسے اہم واقعات بھی
مل جاتے ہیں جو دوسری جگہ نہیں مل سکتے۔

تاریخی نظموں میں سے "چند" کا ذکر تو میں اِس سے پہلے کر چکا ہوں
جو راجپوتانے کا ہومر بھی ہی اور ہنوسی دیدیس بھی۔ دوسری کتاب "چترپرکاش"
ہی جو چتر سال، راجہ بندھیل کھنڈ، کی تاریخ ہی۔ اِس کا مصنف لال کوی ہی۔
اِن کے علاوہ ایک کتاب "گوپ چکا کتھا" یا تاریخ گوالیار ہی اور ایسی ہی اور
چند کتابیں ہیں۔ یہاں میں مان کبیشر کی "راج ولاس" کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، یہ
رام راج سنگھ راجۂ میواڑ (مخالف اورنگ زیب) کا شاعر ہی، ایک دوسری کتاب
"ہمیر راسا" ہی جو ہمیر راجۂ چتوڑ کے حالات میں ہی۔ "ہری چندر لیلا" میں راجہ
ہری چندر کے حالات ہیں۔ "سورج پرکاش"، میں سورج بنسی خاندان کی
تاریخ ہی۔ اِس کا مصنف کرن ہی جو شاعر بھی اچھا ہی اور سپاہی بھی۔ ایک منظوم

کتاب ابھے سنگھ راجۂ مارواڑ کے حالات میں ہی اور بس - اِس راجہ کی حکومت ۱۷۲۴ سے ۱۷۲۸ء تک رہی، لیکن کتاب کے شروع میں بطور تمہید کے راٹھوروں کی تاریخ پر بھی جو اپنا نسب سورج بنسی خاندان سے ملاتے ہیں ایک سرسری سی نظر ڈالی ہی - بھاشا کی ایک نظم "گرب چنتامنی" کرن کی شان میں لکھی گئی ہی، جو گجرات کا نامور راجہ گزرا ہی اور جسے پٹھان سلطان علاءالدین شاہ سکندر ثانی نے سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں شکست دے کر مغلوب کیا - "راج پٹن" میواڑ کی تاریخ ہی، جس کا مصنّف رنچھوڑ بھٹ ہی - "رشابھا چرتر" میں جینیوں کے ایک رشی رشابھا کے سوانح ہیں - "بنس کلی" کتاب انساب ہی اور اس کا مصنّف بکوٹا ہی - "کلپا درم" جے سنگھ کا ایک قسم کا تاریخی روزنامچہ ہی - اسی طرح کی اور کتابیں بھی ہیں -

صرف ہندو مصنفوں کی بدولت ہندوستانی میں چند تاریخی یادگاریں نظر آتی ہیں - اُنھوں نے اِسلامی مضامین پر بھی بعض کتابیں لکھی ہیں - مثلاً ہری ناتھ کی "پوتھی محمد شاہ" جس میں محمد شاہ کی تاریخ ہی -

اِس زبان کی اُردو شاخ میں ہم صرف ترجمے پاتے ہیں - تاہم اِن میں بعض ایسی تالیفات ہیں جو بذات خود بہت دلچسپ ہیں - علاوہ اُن کتابوں کے جن کا ذکر میں کسی دوسری جگہ کر چکا ہوں، یہاں بعض کا ذکر کروں گا - دہلی[1] اور آگرے[2] پر بہت دلچسپ کتابیں موجود ہیں - "کلکتہ نامہ" جس میں کلکتے کے حالات ہیں، نظم میں ہی - نصرتی کا "علی نامہ" جس میں علی عادل شاہ کی تاریخ ہی؛ "واقعات گورکھا" جو نیپال کا صوبہ ہی اور جہاں کے راجاؤں نے

---

[1] آثار الصنادید - اِس کتاب سے کئی بار اقتباس دے چکا ہوں -

[2] تاریخ آگرہ -

اپنا تسلط تمام نیپال پر کرلیا تھا - ایک نظم سومناتھ پٹن کی تباہی پر ہی - انگریزوں کی حکومتِ بنگال کی تاریخ مؤلفۂ نور محمد، خاندان سندھیا کی تاریخ مؤلفۂ دھرم نراین وغیرہ -

ہندوستانی میں خود نوشت سوانح بھی ہیں، علاوہ تیمور، بابر، اکبر اور جہانگیر کے تزکوں کے جو ترکی اور فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں، پتمبر سنگھ، موہن لال، علی حسین اور بعض دوسرے اصحاب کے خود نوشت حالات بھی موجود ہیں، جن کا ذکر میں اِبتدا میں کرچکا ہوں -

جو کچھ بھی ہو اہلِ مشرق کی نظروں میں تاریخ کی وہ وقعت نہیں جو ہم میں ہی - ہندوستان کے ایک جدید مورخ نے اپنی تاریخ کے عنوان پر حافظ کا یہ شعر لکھا ہی :-

حدیث از مطرب و می گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نہ کشود و نکشاید بحکمت این معما را

اب میں چند سفرناموں کا ذکر کرتا ہوں : سفرنامۂ یوسف خاں لکھنوی - یہ سفر انگلستان اور فرانس کا ہی جو اُنھوں نے ۱۸۳۰ء میں کیا - یہ کتاب دہلی میں چھپی ہی - کریم خاں دہلوی کا سفرنامۂ لندن ۱۸۴۰ء - اس کا ترجمہ میں نے "اورینٹ ریویو" میں شائع کیا - پہلے صاحب نسلاً پٹھان اور درویش یا صوفی ہیں اور کمبل پوش کے نام سے مشہور رہیں -

مذہبی فلسفے کا ذخیرہ بہت ضخیم اور دلچسپ ہی اور زیادہ تر اُس کا تعلق ہندو مذہب سے ہی - مجھے درحقیقت اپنا تبصرہ اِسی سے شروع کرنا چاہیے تھا - کبیر پنتھیوں، سکھوں، جینیوں اور ویشنویوں کی تصانیف بہ کثرت ہیں - کچھ کچھ

---

[۱] ٹاڈ کا سفرنامہ صفحہ ۲۳۱ -

شیوائیوں کی کتابیں بھی ہیں، مثلاً "مہا دیو چرتر"، "شولیلامرتم"، "گورامنگل" وغیرہ۔

مسلمانوں کے مذہبی فلسفے یا دینیات میں اُن کے مذہب یا عبادت کی کتابیں ہیں۔ شاعرانہ تالیفات، آنحضرت صلعم، حضرت فاطمہ، امام حسن، امام حسین کی منقبت میں ہیں یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی شان میں بھی نظمیں پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ مسلمان تثلیث کے مخالف ہیں مگر وہ اُنھیں بھی دوسرے پیغمبروں کے برابر سمجھتے ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں شیعوں کی تعداد بہت ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کی مذہبی تصانیف زیادہ تر سُنّیوں ہی کی لکھی ہوئی ہیں۔ تاہم بعض کتابیں شیعوں کی تصنیف سے بھی ہیں، لیکن اِن میں عجیب تصانیف اُن مسلمان فرقوں کی ہیں جو ہندوستان ہی سے مخصوص ہیں، مثلاً "سیّد احمدیوں" یا ہندوستانی وہابیوں اور "روشنائیوں" کی تصانیف اور اُن کی تردیدی کتابیں۔

قانون کا تعلق مذہب سے جیسا ہندوؤں میں ہے ویسا ہی مسلمانوں میں ہے۔ دیوانی قانون، مذہبی قانون (فقہ) سے بالکل ملا ہُوا ہے۔ ہندوستانی ادب میں اِس کے متعلق بعض کارآمد کتابیں پائی جاتی ہیں، مگر وہ عموماً ترجمے ہیں۔

سائنس اور دیگر علوم وفنون پر ایسی کتابیں نہیں جو قابلِ ذکر ہوں۔ اِس قسم کی کتابیں تقریباً سب کی سب جدید اور انگریزی طرز پر لکھی ہوئی ہیں۔ بہرحال یہ ترجمے اور تالیفات اُن لوگوں کے لیے مفید ہیں جن کی خاطر وہ لکھی گئی ہیں۔ اور اِس قسم کی تمام کتابیں اہل ہند کو ہمارے عقائد اور جدید اختراعات اور ایجادات سے باخبر رکھتی ہیں۔

ایسی تصانیف میں، جو ترجمے نہیں، بعض فن تعمیرات پر ہیں؛ بعض سنگ تراشی پر؛ کچھ طبی نباتات پر، جیسے چوب چینی کے خواص پر؛ اِسی طرح

شاہین اور باز کے فن پر (جو فون ہامر آنجہانی کی کتاب کے مماثل ہیں)؛ فن بیطاری پر؛ موتیوں[1] کی قیمت اور وزن پر؛ شطرنج پر؛ خوابوں کی تعبیر اور طباخی کے فن پر۔
ہندوستانی ادب کی اہم شاخ مشرقی زبانوں کی تصانیف کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمے سنسکرت، فارسی اور عربی کی قدیم اور مشکل تصانیف کے سمجھنے کے لیے بہت کار آمد ہیں، کیونکہ یہ اصل کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں اور اُنھیں قدرتی مناظر اور اُنھیں عادات و رسوم کے درمیان بیٹھ کر لکھے جاتے ہیں۔ میں اس سے قبل ایسی بہت سی کتابوں کا نام لکھ چکا ہوں؛ اُس کا اِعادہ یہاں نہیں کروں گا۔

مجھے اِس کی اِطلاع نہیں کہ ویدوں کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں ہوا ہے یا نہیں۔ البتہ ایک اِعلان اِس مضمون کا چھپا تھا کہ ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے ترجمے کا ایک سلسلہ شائع کیا جائے گا اور ویدوں کا ترجمہ اُس کا ایک جز ہو گا۔ قرآن کے ترجمے بہت سے ہو چکے ہیں جن کا خاص امتیاز یہ ہے کہ بہت صحت اور احتیاط کے ساتھ کیے گئے ہیں۔

سید احمد نے اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ اکثر ترجموں کے ساتھ تفسیر اور شرح بھی ہوتی ہے۔ ایک ترجمہ جو دہلی میں چھپا ہے اُس سے بڑی رواداری کا اظہار ہوتا ہے؛ کیونکہ اُس میں اہلِ سنت اور اہل تشیع دونوں کے عقائد کے مطابق تفسیر دی گئی ہے۔ قرآن کی ایک تفسیر منظوم بھی ہے جس کا مصنف اشرف ہے۔ ضمناً میں یہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ایرانیوں کی تقلید میں ہندی مسلمان برخلاف ترکوں کے اپنی مقدس کتاب کا ترجمہ عوام کی زبان میں کرنے سے خائف نہیں۔ ہندوستان کی عورتیں جمعے کے روز اُسی طرح قرآن پڑھتی ہیں جیسے انگریز عورتیں

---

[1] رسالۂ "موتی" مطبوعہ حیدرآباد ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵-۳۶ء)۔

اتوار کے روز بائبل-عام طور پر ہندوستان کی عورتیں ٹرکی عورتوں سے، جو حسن میں زیادہ مشہور ہیں، زیادہ تعلیم یافتہ ہوتی ہیں - سنسکرت کے ترجموں میں "مہا بھارت"، "ہتوپدیش" اور "ترک سنگرہ" کے ترجمے ہیں - اخیر کتاب ہندی فلسفے کی ہے اور اُس کا مصنف اونم بھٹ ہے[1]-

ہندوستانی ڈراموں میں وہ خاص خاص ڈرامے، جن کا ترجمہ ولسن نے کیا ہے، "سنسکرت ناٹک" کے نام سے دہلی میں ۱۸۴۵ء میں شائع ہوئے -

"مہنا سٹوترا" کا ترجمہ سنسکرت سے سمر سنگھ نے کیا ہے حالانکہ یہ شیوائیوں کی کتاب ہے، وغیرہ -

۱۸۴۵ء میں دہلی میں رگھو ونس کا ترجمہ ہو رہا تھا - یہ نظم رگھو خاندان پر ہے اور کالی داس سے منسوب کی جاتی ہے - ادیاتما کی راماین اور سنسکرت کی دوسری کتابوں کے ترجمے بھی ہو رہے تھے مگر مجھے اِس کا علم نہیں کہ وہ شائع بھی ہوئے یا نہیں - میں اِس رسالے کی ابتدا میں متعدد ترجموں کا ذکر کر چکا ہوں -

سنسکرت کے ضمن میں مجھے ہندوستان کی جدید زبانوں یعنی تامل، بنگالی اور مرہٹی کے ترجموں کا بھی ذکر کرنا چاہیے - مرہٹی میں منجملہ دوسری کتابوں کے "ستیا رتر وپن" نے اچھی خاصی شہرت حاصل کی ہے -

عربی سے جن کتابوں کا ترجمہ ہؤا ہے اُن میں خاص خاص کتابیں یہ ہیں: تاریخ ابوالفدا، مترجمہ کریم وعرشی؛ اِبن خلکان، مترجمہ سبحان بخش؛ "اِخوان الصفا" کا ذکر اوپر ہو چکا ہے؛ مشکوٰۃ شریف، فقہ[2] کی مشہور کتاب؛

---

[1] یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں بنارس میں سنسکرت کے عالم بالن ٹائن Ballantyne کی نگرانی میں طبع ہوئی - اِس میں سنسکرت متن کے ساتھ ہندی اور انگریزی ترجمہ ہے -

[2] [مصنف کو مغالطہ ہؤا ہے - فقہ کی جگہ حدیث ہونا چاہیے - عبدالحق]

"ادب القاضی" فقہ کی دوسری مشہور کتاب ہے جس کا مصنف قدوری ہے۔ اِس کا ترجمہ "مختصر" سے کیا گیا ہے۔

"مقامات حریری" کا لفظی ترجمہ دہلی میں شروع ہوا تھا، لیکن جس وجہ سے مجھے فرانسیسی ترجمہ ترک کرنا پڑا، اُسی وجہ سے ہندوستانی مترجموں کو بھی دست بردار ہونا پڑا۔ بات یہ ہے کہ مصنّف نے جو لفظی تلازمے اور صنعت کی رعایت رکھی ہے، اور جو کتاب کا اصلی حسن ہے، وہ ترجمے میں قائم نہیں رہ سکتی۔

"الف لیلہ" عربی ادب میں بے نظیر کتاب ہے، ہندوستانی میں اس کے مترجم ہندو مسلمان دونوں ہیں۔ مسلمانوں میں ایک مولوی حسن علی خاں ہیں جو اسی زمانے کے مصنّف ہیں، دہلی کالج میں پروفیسر رہ چکے ہیں اور کئی اور کتابوں کے مترجم بھی ہیں۔ دوسرے شمس الدین احمد ہیں جنھوں نے مدراس میں پہلی دو سو راتوں کا ترجمہ شائع کیا، اُنھوں نے کلکتہ اڈیشن کی پیروی کی ہے، جو ہابشت اور فلائشر سے بہت مختلف ہے۔ ہندوؤں میں دیاشنکر نسیم ہیں، جن کا ترجمہ[1] لکھنؤ میں ۱۲۴۴ھ (۲۹-۱۸۲۸ء) میں تین جلدوں میں چھپا۔ حال ہی میں دہلی میں پچاس راتوں کا ترجمہ عربی سے اُردو میں چھپا ہے، اُسی میں اِس کتاب کے دوسرے قصّے بھی منتخب کر کے شامل کر دیے گئے ہیں۔ "غانم سوداگر بچے" کا قصہ[2] الگ بھی چھپ چکا ہے۔

"ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی" نے ابوالفدا کے جغرافیے کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

---

[1] [یہ غلط ہے۔ یہ ترجمہ اصغر علی نسیم کا کیا ہوا ہے۔ عبدالحق]

[2] الف لیلہ لین کا انگریزی ترجمہ۔ ج ۱، ص ۴۸۷۔ [یہ وہ "سوداگر بچے" کا قصہ نہیں، جو آج بھی بازار میں بکتا ہے۔ الف لیلہ میں غانم، ایک سوداگر بچے، کا قصّہ بہت دلچسپ ہے۔ یہاں وہ مراد ہے۔ ع۔ ص]

اِس کے علاوہ رشید الدین کی تاریخ مغول اور تاریخ ابن خلدون اور بعض مشہور و معروف کتابوں کے ترجموں کا اعلان کیا ہی، مگر میرا خیال ہی کہ یہ ترجمے یونہیں رہ گئے اور کبھی شائع نہ ہوئے۔

فارسی کے ترجمے بہ کثرت ہیں۔ بعض مقبول فارسی کتابوں کے کئی کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ مثلاً "گلستاں" کے کئی ترجمے ہوئے اور کئی بار چھپے۔ "بوستان" سعدی کا ترجمہ مغل نے کیا؛ جس سے بعض مشکل مقامات کے حل میں مدد ملتی ہی۔ شاہنامے کے خلاصے کا ترجمہ نظم میں منشی[۱] نے اور نثر میں ایک تو محمد علی ترمذی نے اور دوسرا سرور نے "سرورِ سلطانی" کے نام سے کیا، سہراب کے قصے کا ترجمہ کاظم نے کیا، جلال الدین رومی کی مشہور نظم کے بھی جو "مثنوی شریف"[۲] کے نام سے مشہور ہی ترجمے ہوئے ہیں؛ "پند نامۂ" عطار اور "پند نامۂ" سعدی؛ "منطق الطیر" اور "حسن و عشق" کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں؛ "اظہار دانش" کا ترجمہ دوست نے کیا ہی؛ بہار دانش کا ترجمہ بھی ہو چکا ہی۔ محمد اعظم کی "تاریخ کشمیر" کا ترجمہ شرافت نے کیا جو کئی بار چھپ چکا ہی؛ تاریخ طبری کا ترجمہ جعفر شاہ نے کیا ہی۔ اِن کے علاوہ اور بہت سی کتابیں ہیں۔

ایک بات قابل ذکر یہ ہی کہ بعض ہندی کتابوں کا ترجمہ مشرق کی دوسری زبانوں میں کیا گیا ہی۔ مثلاً "ست سئی" بہاری کا ترجمہ سنسکرت میں ہوا ہی۔ "باغ و بہار" کا ارمنی زبان میں؛ "راگ درشن"[۳] کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہی؛

---

[۱] خسروان عجم کے نام سے۔

[۲] اِس کے کامل ترجمے کے متعلق، جو نشاط نے کیا ہی، کریم نے ذکر کیا ہی۔ ایک دوسرا ترجمہ شاہ متاں نے کیا ہی یہ پوری کتاب کا نہیں بلکہ ملخص کا ترجمہ ہی۔ یہ دونوں نظم میں ہیں اور ۱۸۴۵ء میں کلکتے میں طبع ہوئے۔

[۳] یہ کتاب مان سنگھ راجۂ گوالیار کے حکم سے مرتب ہوئی۔ نظم میں ہندوستانی راگوں کا بیان ہی۔ فارسی میں اس کا ترجمہ فقیر اللہ نے کیا۔ (دیکھو W. Ouseley, Oriental Collections, (Vol. III P. 75

اُردو کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ بھی اِس زبان میں، جو جدید ہندوستان میں لاطینی کا درجہ رکھتی ہے، ہو چکا ہے۔ مثلاً دھرم سنگھ کا قصہ اور سورج پور کی کہانی۔ یہ اخلاقی قصے ہیں جو فارسی میں ترجمہ ہو گئے ہیں؛ پہلا ترجمہ "قصۂ صادق خاں" کے نام سے اور دوسرا "قصۂ شمس آباد" کے نام سے ہوا ہے۔

اِسی کے ساتھ میں اُن بے شمار ترجموں کا بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں جو انگریزی سے اُردو میں ہوئے ہیں اور یہ ہندوستان کے جدید آقاؤں کے حق میں تعریف کی بات ہے۔ فرانسیسی زبان سے بھی بہت سے ترجمے ہوئے ہیں۔ مثلاً فلوری کی تاریخی کتاب عقائد بصورت سوال و جواب، جس کے ترجمے کے لیے ہم کیتھولک مشنریوں کے ممنون ہیں؛ یا نامور مستشرق دَ ساسی کی عربی صرف و نحو کا ترجمہ، جو کئی سال سے دہلی کے مطبع کے لیے تیار ہو رہا ہے؛ اور رولاں کی ملخص تاریخ قدیم کا ترجمہ وغیرہ۔ لیکن فرانسیسی کتابوں کے ترجمے جو ہندوستانی میں ہوئے ہیں وہ انگریزی سے ہوئے ہیں اور ہمارے ہاں کے بہت سے فضلا مثلاً ایلی دَ بوماں یہ نہیں جانتے کہ اُن کی کتابیں اِس بدیسی لباس میں آگرے اور دِلّی میں پڑھی جاتی ہیں۔ یہ ایک غیر معمولی بات ہے کہ سید احمد نے اپنی عجیب "اِسلامی تفسیر بائبل" میں بائبل کا ترجمہ عبرانی سے کرنا شروع کیا ہے۔

اِن ترجموں کے افادے سے کسی کو اِنکار نہیں ہو سکتا، اِن کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان والوں کو ہمارے علوم و فنون، ہماری قدیم و جدید تاریخ، یونان و روما کی تاریخ اور اور مشہور کتابوں مثلاً رسے لاس (Rasselas) قزلباش (Cazilbasch) وکار آف ویکفیلڈ Vicar of Wakefield، رابنسن کروسو (Robinson Crusoe)، بنین کی "پلگرمس پروگرس" (Bunyan's Pilgrim's Progress) "دی اکانمی آف ہیومن لائف"

(The Economy of Human Life) وغیرہ سے آشنا کیا جائے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ عیسوی مذہب سے، جو ایک زندہ درخت ہے اور جس کا سایہ بیت المقدس سے لے کر تمام عالم پر پھیلا ہوا ہے، واقف ہو جائیں۔ ایسے ترجمے جو عیسوی مذہب سے متعلق ہیں، اُن میں سے بعض میں ہمارے عقائد سادہ طور سے بیان کیے گئے ہیں اور بہت سی باتیں ہماری کتب مقدسہ سے جابجا نقل ہوئی ہیں اور بعض مناظرے کی کتابیں ہیں جن میں خاص طور پر مسلمانوں سے بحث ہے جو عیسائی مذہب سے علانیہ تعصب رکھتے ہیں۔

اِس قسم کے مطبوعات میں سب سے دلچسپ قرآن کا ایک اِڈیشن ہے جسے ایک پریسبی ٹیرین امریکن نے ۱۸۴۴ع میں الہ آباد میں طبع کرایا۔ اِس کے شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں مسلمانوں کی غلطیوں اور عیسائی مذہب کے خلاف اُن کے اعتراضوں کی تردید کی گئی ہے۔ متن کے ساتھ تفسیر بھی ہے جو اُسی قسم کی ہے جو مراچی (Maracci) نے لکھی ہے۔ باقی کے لیے ہندوستان میں اِس کا دروازہ پہلے ہی سے ایک پروٹسٹنٹ مشنری بنجمن نے اپنی کتاب "Compendiosa Alcorani refutatio, indice" لکھ کر کھول دیا ہے، یہ کتاب ہالے (Halle) میں ۱۷۴۴ع میں شائع ہوئی تھی۔

مذہبی کتابوں میں (Anglican Liturgy) کا ترجمہ بھی ہے۔ یہ ترجمہ صرف ہندوستانیوں کی واقفیت کے لیے نہیں بلکہ اُن نو عیسائی ہندیوں کے استعمال کے لیے ہے جن کی خاطر کلکتے اور بلاشبہ بعض دوسرے شہروں کے گرجوں میں ہندوستانی زبان میں عبادت ہوتی ہے، جیسے نو عیسائی یہودیوں کے لیے لندن اور یروشلم میں عبادت کے رسوم عبرانی میں ادا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ نغمات بھی ہندوستانی میں لکھے گئے ہیں، لیکن بحریں انگریزی ہیں تاکہ ویسٹ منسٹر ایبے

یا سینٹ پال کے گرجوں میں ایک ہی راگ میں گائے جا سکیں، جیسا کہ پیرس کے لوتھری، فرانسیسی الفاظ کو جرمانی گیت میں لے آئے ہیں۔

کچھ دنوں قبل تک ہندوستانی کتابیں قلمی ہوتی تھیں کیونکہ مطبعے عام نہ ہوئے تھے۔ اِن کتابوں کے حروف کی نسبت یہ خیال ہی کہ یہ بھاری اور بے ڈول ہیں، نہ تو یہ خط پورا نستعلیق ہی جو اعلیٰ درجے کی قلمی کتابوں اور قطعات کے لیے استعمال ہوتا ہی اور نہ شکستہ، اور نہ مشرقی خوش خطی اور نہ خوب صورت عنوانات اور زیبائش کے لیے موزوں ہی۔ خوشی کی بات ہی کہ اِن دشواریوں کو سنگی مطبع نے رفع کردیا اور لوگوں نے اُس کو بڑے شوق سے رواج دینا شروع کردیا ہی۔ سب سے پہلا لیتھوگراف مطبع ۱۸۳۷ء میں دہلی میں قائم ہُوا اور ۱۸۵۲ء میں ممالک مغربی شمالی کے شہروں میں ایسے مطابع کی تعداد ۳۴ تک پہنچ گئی تھی۔ شمال کے ہر شہر میں اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اِس قسم کے مطبعے قائم ہوگئے ہیں۔ مثلاً۔ صرف لکھنؤ اور کانپور میں ۲۳ ہیں جن میں کئی سو کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اِن میں سے بعض دس دس بار طبع ہو چکی ہیں۔ آگرہ گورنمنٹ گزٹ بابت یکم جون ۱۸۵۵ء میں تقریباً دوسو ہندوستانی مطبوعات کی فہرست دی تھی جس میں نقشے وغیرہ شریک نہ تھے، اور اگرچہ یہ ادب اور علوم و فنون پر ہندوستانیوں کے استعمال کے لیے محض ابتدائی کتابیں ہیں تاہم بعض ایسی ہیں جن سے علمائے یورپ بھی اغماض نہیں کرسکتے، مثلاً انوار سہیلی اور گلستاں کے خلاصے جو کریم الدین نے مرتب کیے ہیں؛ سفرنامۂ امین چند، جس میں پنجاب، کشمیر، سندھ، دکن، خاندیس، مالوے اور راجپوتانے کی سیاحت کا حال ہی، اور ایک کتاب "چندودیکا" جس کا علم اب تک یورپ کو نہ تھا، وغیرہ۔

"ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی"، ایک قابل تعریف جماعت ہی جس نے

ادبی معلومات اور لیتھوگرافی کی اِشاعت میں بہت بڑا کام کیا ہی۔ اِس انجمن کا پہلا سکرٹری ہمارا ہم وطن موسیو بوٹرو (M. Boutros) تھا جو اُس وقت دہلی کالج کا پرنسپل تھا، اِس انجمن نے سنسکرت، عربی، فارسی کی اعلیٰ درجے کی تصانیف نیز انگریزی کی مفید کتب کے دیسی زبان میں عمدہ ترجمے کر کے اہلِ ہند کی بڑی خدمت کی ہی۔

چھپائی کے ذکر سے خود بخود میرا خیال ایک دوسرے مضمون کی طرف پہنچا جس کا تعلق بھی ایک طرح ادب سے ہی اور جو پہلے ایشیا میں ناپید تھا مگر اب ہندوستان میں ترقی کر رہا ہی۔ میرا مطلب پریس (اخبار و رسائل) سے ہی جس کی حکومت روز بروز پھیلتی جاتی ہی اور جس نے فارغ البال بے فکرے ہندوستانی کو بھی اپنا غلام بنا لیا ہی۔ پانچ سال ہوئے کلکتے میں سولہ اخبار ایسے تھے جو دیسی نکالتے تھے، یعنی پانچ فارسی یا ہندوستانی میں اور نو بنگالی میں اور دو انگریزی میں[1]۔ کچھ دنوں تک مولوی نصیرالدین مارتند اخبار شائع کرتے رہے، جس کے پانچ کالم ہوتے تھے اور جو پانچ زبانوں میں ہوتا تھا، یعنی ہندی، ہندوستانی، بنگالی، فارسی اور انگریزی میں[2]۔ اور تھوڑے ہی دن ہوئے کہ ایک دیسی اخبار خاص کر عورتوں کے لیے شائع ہوا ہی۔ بمبئی میں تین چار ہندوستانی[3] اخبار ہیں جو عام طور پر سب ہندیوں کے لیے ہیں اور دو خاص مسلمانوں کے لیے۔ اِن کے علاوہ چار گجراتی میں ہیں جو پارسیوں کے لیے ہیں اور دو مرہٹی میں مرہٹوں کے لیے۔ مدراس میں بھی کئی ہندوستانی اخبار ہیں[4] اور

---

[1] ولسن۔ دی ایتھے نیم، دسمبر ۱۸۴۸ء۔
[2] ۱۸۴۶ء میں۔
[3] بمبئی کا ہرکارہ، اخبار دفتر جزیرۂ بمبئی، تازہ بہار وغیرہ۔
[4] مرآۃ الاخبار، قاصد مدراس وغیرہ۔

اُس سے زیادہ دہلی، میرٹھ، آگرے، لاہور، بنارس اور لکھنؤ میں ہیں[1]۔ چند اخبار سری رام پور، کدار پور، مرزا پور، بھرت پور، ملتان، بریلی، اندور[2] وغیرہ میں بھی ہیں۔

اگر یہ اخبار آسانی سے یورپ میں پہنچ سکیں تو بہت سی دلچسپ معلومات اِن میں ایسی ملے گی جو ہمارے اخباروں میں نقل کرنے کے قابل ہوگی اور جس پر ہوریس کا یہ قول صادق آسکتا ہے۔

"یہ سب ایک دوسرے کو مدد دیں گے اور اِن میں باہم ایک خوشگوار اتحاد پیدا ہو جائے گا۔"

---

[1] رپورٹ انجمن ترقی تعلیم دیسی زبان ۱۸۴۵ء، از ڈاکٹر اشپرنگر۔

[2] اِن زبانوں کے شمار و اعداد کا نقشہ دیکھو "فرینڈ آف انڈیا" بابت مارچ ۱۸۵۳ء میں۔
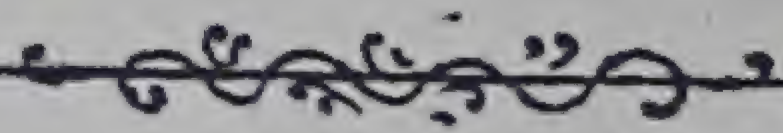
چھٹا خطبہ

۲ دسمبر ۱۸۵۵ع

حاضرین!

اپنے لکچروں کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے میں ہر سال ہندوستان کی ادبی تحریک کی ترقی آپ صاحبوں کے سامنے بیان کرتا ہوں - کم از کم اُس زبان کی ترقی جو خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی کہی جاتی ہی اور جس کی دونوں شاخوں یعنے ہندو (ہندی) اور مسلمانی شاخ (اُردو) کے سیکھنے کے لیے آپ لوگ یہاں آئے ہیں -

اِس سال اپنا یہ فرض، کم سے کم صوبۂ مغربی و شمالی کے متعلق، مَیں اِس وجہ سے اور بھی زیادہ آسانی کے ساتھ انجام دے سکتا ہوں کہ صوبۂ مغربی و شمالی کی سرکاری رپورٹ مجھے حال ہی میں پہنچ گئی ہی جس میں دیسی چھاپے خانوں اور گزشتہ سال کے شائع شدہ اخباروں اور کتابوں کا ذکر کیا گیا ہی - اِس کے علاوہ میرے پاس گزشتہ پہلی جون کے آگرہ گورنمنٹ گزٹ کی ایک جلد بھی موجود ہی، جس میں اِن کتابوں کی مکمل فہرست شائع ہوئی ہی -

صاحبو! اِن چھاپے خانوں کی پہلی جنوری ۱۸۵۲ع تک کی حالت میں نے اپنے کسی لکچر میں بیان کی تھی - سرکاری رپورٹ کے مطابق صوبۂ مغربی و شمالی میں اُس وقت دیسیوں کے ۳۲ چھاپے خانے تھے جہاں سے ۲۶ ہندوستانی اخبارات شائع ہوتے تھے - ۱۸۵۱ع میں اِن چھاپے خانوں سے ۱۲۶ مختلف

کتابیں شائع ہوئیں جو تقریباً سب کی سب ہندوستانی زبان میں تھیں - پہلی جنوری ۱۸۵۳ء تک چھاپے خانوں کی تعداد ۳۷ تک پہنچ گئی اور ہندوستانی اخبارات کی تعداد ۳۰ ہوگئی - اور اُن تمام کتابوں کی تعداد جو ۱۸۵۲ء میں چھپیں ۱۳۰ تھی - بہرحال ہم کو معلوم ہے کہ پہلی جنوری ۱۸۵۴ء تک جب کہ میرے لکچر ختم ہوئے، چالیس چھاپے خانے اور ۳۳ اخبارات اِس صوبے میں موجود تھے، اور ۱۸۵۳ء میں ۱۹۵ کتابیں شائع ہوئیں - اِس وقت چند پرانے اخبارات، جن سے میں آپ حضرات کا تعارف کراچکا ہوں، بند ہوگئے ہیں - لیکن پھر بھی جدید اخبارات کی تعداد بمقابلۂ اُس تعداد کے، جو پہلی جنوری ۱۸۵۲ء میں دی گئی تھی، بقدر ۳ کے زیادہ تھی - اخبارات جو بند ہوگئے اُن کے نام یہ ہیں :- "زائرین ہند" بنارس کا، جس کے متعلق میں ایک مفصل آرٹکل (Débats) مورخہ ۱۶ جنوری ۱۸۵۱ء میں شائع کراچکا ہوں - "باغ و بہار" بھی اِسی شہر سے شائع ہوتا تھا نیز "بنارس گزٹ" جو باوجود اپنے انگریزی نام کے اُردو میں شائع ہوتا تھا؛ دہلی کا "فوائدالناظرین"، میرٹھ کا "مفتاح الاخبار"، لاہور کا "دریاے نور"، "شملہ اخبار"، لدھیانہ کا "نورٌ علیٰ نور" اور امرتسر کا "باغ نور"۔

صوبۂ مغربی و شمالی میں پہلی جنوری ۱۸۵۴ء تک جو چالیس چھاپے خانے موجود تھے اُن کی تقسیم اِس طرح پر ہوئی تھی کہ دس آگرے میں تھے، سات بنارس میں، ایک بریلی میں، ایک بھرتپور میں، دو لاہور میں، دو ملتان میں اور ایک سیالکوٹ میں -

نئے اخبارات جن سے ابھی میں نے آپ کو آگاہ نہیں کیا، یہ ہیں :- آگرے میں "نورالاخبار" اور "بُدھی پرکاش"- یہ دونوں پرچے حقیقت میں

ایک ہی ہیں اور ایک ہی شخص کی اِدارت میں شائع ہوتے ہیں؛ پہلا مسلمانوں کی اور دوسرا ہندوؤں کی زبان میں - اِن دونوں کا اڈیٹر سدا سُکھ نامی ایک لائق ہندو ہی، جو انگریزی میں بھی خاصی لیاقت رکھتا ہی اور کئی کتابوں کا مصنّف بھی ہی - یہ اخبار بہت کامیاب ہوئے کیونکہ اِن میں دلچسپ مضامین اور خبریں شائع کرنے کی کوشش کی جاتی ہی اور تاریخ، جغرافیا، ارضیات اور تعلیم پر اکثر پُرمغز و مفید مضامین نکلتے رہتے ہیں - اِن اخبارات کا طرز تحریر بہت پاکیزہ ہوتا ہی لیکن بہت پُرتکلّف نہیں ہوتا، کیونکہ اِن میں بڑے بڑے اور شاندار الفاظ و اِستعارات کا استعمال نہیں کیا جاتا جسے مشرقی لوگ عام طور سے اِستعمال کرتے ہیں -

بنارس سے ایک اُردو اخبار جاری ہُوا ہی جس کا نام " آفتاب ہند" ہی، اِس کے اڈیٹر بابو گوبند رگھوناتھ ہیں جو سکھوں کی تاریخ اور دوسری قابل قدر تصانیف کے مصنّف ہیں - یہ اخبار اپنے مخصوص طرز تحریر اور اعلیٰ علمی اور ادبی مضامین کی وجہ سے جو ہمیشہ اِس میں شائع ہوتے رہتے ہیں، بہت مشہور ہی -

۱۸۵۳ع سے ایک اُردو جریدہ " فتح الاخبار" ضلع علی گڑھ کے قصبۂ کول سے نکلتا ہی، جو باوجود اپنے شاندار نام کے بہت سادہ اور سلیس زبان میں شائع ہوتا ہی - اِس میں علاوہ خبروں اور آگرے کے سرکاری اخبار کے انتخابات کے، عدالتوں کے مقدموں کی کارروائی بھی چھپتی ہی -

مغلیہ سلطنت کے قدیم دارالسلطنت دہلی سے باوجود اُن پانچ اخباروں کے، جو وہاں پہلے ہی سے موجود تھے، تین اُردو اخبار ۱۸۵۳ع سے اور جاری ہوئے ہیں جن سے اُن کی تعداد آٹھ ہوگئی ہی؛ حالانکہ قسطنطنیہ میں ترکی زبان کے صرف پانچ اخبار شائع ہوتے ہیں - نئے اخباروں کے نام یہ ہیں :-

"صادق الاخبار" جسے مصطفائی پریس کے مہتمم مصطفیٰ خاں نکالتے ہیں۔ یہ مطبع پہلے لکھنؤ میں تھا لیکن چند خاص وجوہ کی بنا پر یہ کارخانہ وہاں بند کردیا گیا۔ اُس کے بعد مصطفیٰ خاں نے اُس کی دو نئی شاخیں، ایک کانپور اور دوسری دہلی میں، قائم کیں۔ یہ پرچہ دہلی سے شائع ہوتا ہی۔ اِسی نام کا ایک دوسرا اخبار فارسی زبان میں بھی شائع ہوتا ہی۔ دہلی کے دوسرے نئے اخبار "نورمشرقی" اور "نورمغربی" ہیں۔ اِن دونوں کا ایک ہی مقصد ہی، یعنی اہل ملک میں مفید معلومات کی اشاعت اور اُن کو حب بنی نوع انسان کے خیالات اور اصول سے باخبر رکھنا۔ لیکن اپنے ناموں کے لحاظ سے پہلا مشرقی خیالات کا اظہار کرتا ہی اور دوسرا مغربی یعنی یورپین خیالات کا۔

گوالیار سے ایک شخص لکشمی پرشاد، جو وہاں کی حکومت کا ملازم ہی، ۵۳ء سے ایک سرکاری اخبار نکالتا ہی جس میں دو کالم ہوتے ہیں۔ ایک اُردو میں، دوسرا ہندی میں۔ یہی لائق شخص اِس سے قبل بریلی سے ایک اخبار نکالتا تھا جس میں اکثر حقیقی ادبی دلچسپی کے مضامین شائع ہوتے تھے؛ مثلاً ایک مضمون میں دہلی اور لکھنؤ کی اُردو کا مقابلہ کیا گیا تھا۔

ملتان سے علاوہ اُس اخبار کے جو وہاں پہلے سے موجود تھا، ۱۸۵۳ء سے ایک اور اُردو اخبار شائع ہو رہا ہی۔ اِس کا نام "شعاع شمس" ہی اور یہ مہاراجہ ہلکر کی سرپرستی میں ایک لائق درویش غلام نصیرالدین کی ادارت میں شائع ہوتا ہی۔

سب سے آخر میں سیالکوٹ سے ایک اخبار "چشمۂ فیض" کے نام سے جون ۱۸۵۳ء سے جاری ہوا ہی۔ پنجاب کے اِس شہر اور ضلع (سیالکوٹ) کے باشندے تعلیم کے فوائد کو جیسی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں غالباً تمام ہندوستان

میں اِس کی نظیر نہیں مل سکتی، کیونکہ "دی فرینڈ آف انڈیا" (The Friend of India) نے حال ہی میں یہ خبر شائع کی تھی کہ اِس قرب و جوار کے نو سو پچاس دیہات میں وہ خاص ٹیکس جو حکومت برطانیہ نے دیسیوں کی تعلیم کے لیے قائم کیا تھا پیشگی ادا کر دیا گیا؛ چنانچہ مجوزہ مدارس بغیر کسی توقف کے فوراً کھول دیے گیے۔

صاحبو! میں ابتدائی یا اُس سے بھی کم درجے کی سائنس کی کتابوں کے بارے میں جو ۱۸۵۲ اور ۱۸۵۳ع میں صوبۂ مغربی و شمالی میں شائع ہوئیں کچھ نہیں عرض کروں گا۔ میں صرف اُن کتابوں کا تذکرہ کروں گا جو ادب، تاریخ اور فلسفے کے زمرے میں شامل ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا اِس حیثیت سے میں "چراغ حقیقت" کا نام لوں گا جس میں صوفیوں کے مذہبی اصول سے بحث کی گئی ہے۔ یا "تذکرۃ الکین" کا، جس میں مظاہر قدرت، قابل قدر آثار اور غیر معمولی جانوروں کا تذکرہ ہے۔ اِس کتاب میں کسی قدر اخلاق و تاریخ سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یا "عجائب روزگار" کا، جو درحقیقت اِسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن معلوم ہوتا ہے مگر نام بدل دیا گیا ہے۔ یا "مخزن قدرت" اور "خیالات الصنائع"[1] کا جو ایک ہی قسم کی کتابیں ہیں اور اِن میں مذہبی نقطۂ نظر سے فطرت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔

مجھے آپ کے سامنے قوانین منو (Laws of Manu) کے اُردو ترجمے "منو سن ہتا" کا، عربی کے فاضل ادیب ابوالحسن بغدادی المعروف بہ قدوری کے رسالۂ فقہ کا، جس کا نام "مختصر قدوری" ہے، اور رام چندر کے رسالہ "بھوت ہنگ" کا تذکرہ بھی کرنا چاہیے۔ یہ ہندو ادیب، جس کا میں آپ لوگوں سے تعارف کرا چکا ہوں، عیسائی ہو گیا ہے۔ اِس کی اِس کتاب کا مقصد ہندوستانیوں کو بھوت پریت پر عقیدہ رکھنے سے باز رکھنا ہے، یعنی درآں حالیکہ یورپ میں لوگ اِس

---

[1] [شاید مصنف کو سہو ہوا ہے۔ صحیح نام "حالات الصنائع" ہوگا۔ ع۔ ص۔]

قسم کی ارواح سے حقیقی تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں، ہندو لوگ یورپین اور عیسائی خیالات سے متاثر ہو کر اپنے ہم وطنوں کو ان پر عقیدہ رکھنے سے روکنے کی حتی الوسع کوشش کرتے ہیں۔

میں اِس موقع پر اخلاقی قصّوں کو بھی فراموش کرنا نہیں چاہتا۔ مثلاً "سُبدھی کُبدھی" جس میں بُرے اور بھلے اخلاق کا فرق بتایا گیا ہے۔ یا "بنجارا" جس میں صاف طور سے دنیاوی چیزوں کی بے ثباتی ثابت کی گئی ہے۔ یا فارسی "تاریخ کشمیر" مؤلفہ محمد عظیم کا اُردو ترجمہ۔ یا سبحان کی "تاریخ فقہاے اِسلام" یا یوسف علی خاں کا "سفرنامۂ یورپ"، یا اِس سے بھی زیادہ دلچسپ ہندوستان کے غیر معروف حصّوں میں "فرماں رواے اندور کی سیاحت"۔ اِن دونوں پچھلی کتابوں کا شائع کرنے والا امین چند ہے۔ آخر میں امام بخش صہبائی کی تصانیف خاص کر ذکر کے قابل ہیں، یعنی اُن کی کتاب بلاغت پر اور اُن کا "انتخابِ نظم"، اور اُن کی "قواعدِ اُردو"، اِس لیے اور بھی زیادہ قدر کے قابل ہے کہ اُس کے آخر میں ایک فہرست ضرب الامثال اور محاورات کی شامل ہے۔ کریم (الدین) تذکرہ نگار، جو صہبائی کے ہم عصر ہیں، اپنے "تذکرۃ الشعرا" میں لکھتے ہیں کہ یہ قابل مصنّف دہلی میں فارسی کے سب سے زیادہ فاضل ادیب تصور کیے جاتے ہیں اور اِسی وجہ سے دہلی کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ یہ دہلی کے مشہور محلے "چیلوں کے کوچے"، میں رہتے ہیں؛ ہمیشہ پرانی وضع کا لباس پہنتے ہیں، ڈاڑھی میں مہندی کا خضاب کرتے ہیں، چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔ اِس وقت اِن کی عمر ساٹھ برس کی ہے۔

۵۳-۱۸۵۲ء میں جو کتابیں ایسی شائع ہوئی ہیں جن کا تعلق تخیّل سے ہے، خواہ وہ اصل تصانیف ہوں یا دوسری ایشیائی زبانوں کے ترجمے، اُن میں سے

ئیں صرف ذیل کی چند کتابوں کا ذکر کرتا ہوں :۔ "کرشن بالین"، جس میں کرشن کے بچپن کا حال نظم میں بیان کیا گیا ہے؛ محمد حسین کی "لیلیٰ مجنوں"، ؛ "سفینۂ ظرافت" جو ظریفانہ نظم و نثر کا مجموعہ ہے؛ "شرح قصائد سودا"، جو ہندوستان کے زمانۂ حال کے شعر کا بادشاہ مانا جاتا ہے؛ درد کا دیوان، جو گزشتہ صدی کے بہترین شعرا میں تسلیم کیا جاتا ہے؛ "رامائن" کا ایک خوشنما ہندی اڈیشن اور "انوار سہیلی" کا خلاصہ۔ انوار سہیلی فارسی ادب کی بہترین کتاب ہے جس کا حال ہی میں بہت صحیح ترجمہ مسٹر ایسٹ وِک نے انگریزی میں کیا ہے، جس سے اُن کے ذوقِ سلیم کا پتا چلتا ہے اور جن کو ہم اُن کے متعدد ادبی خدمات کی وجہ سے ایک نیا "دَ ہامر" (De Hammer) خیال کرتے ہیں۔

صاحبو! میں یقین کرتا ہوں کہ آپ لوگ ہندوستان کے اُس انگریز حاکم کی رائے سے اتفاق نہ کریں گے جو اپنی رپورٹ مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۸۵۴ء میں اِن کتابوں کا اور خاص کر "باغ و بہار"، "گل بکاؤلی"، "اخلاق جلالی"، "زبدۃ الخیال"، "پریم ساگر"، "ست سئی"، اور "راج نتی"، کا (جو میری رائے میں ہندوستانی ادب میں بہت نفیس کتابیں ہیں) نہایت حقارت سے ذکر کرتا ہے اور بچوں کا کھیل سمجھتا ہے جن سے دل و دماغ میں ہرگز اعلیٰ اور شریفانہ خیالات پیدا نہیں ہو سکتے۔

یہ آگے چل کر کہتا ہے کہ "راج نتی" کے پڑھنے سے دماغ پر وہی اثر ہوتا ہے جو ایک مدہوش شرابی کو دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ کتاب "ہتوپدیش" کا صرف ہندی ترجمہ ہے جس کی فضیلت کا ہر شخص معترف ہے۔ اِس انگریز کا خیال ہے کہ ہندوستانی لٹریچر کو انگریزی زبان کے ترجموں سے نیا جنم لینا چاہیے۔ غالبًا وہ بھولتا ہے کہ اِنھیں کتابوں میں

بعض اِس قدر دلچسپ ہیں کہ یورپ میں اِنھیں ایسی قبولیت، اور شہرت حاصل ہوئی کہ خالص یورپی کتابیں بھی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ مثال کے طور پر میں صرف ”الف لیلہ“ کا نام لیتا ہوں۔ یہ دنیا کی نہایت دلچسپ کتابوں میں سے ہی اور پھر لطف یہ کہ اِس سے ہمیں مسلمانوں کے رسم و رواج کا بھی علم ہو جاتا ہی۔ یہ صحیح ہی کہ یہ کتاب محض تفنن طبع کے لیے ہی، لیکن کم از کم ”گلی ورس ٹریولس“ Gulliver's Travels سے یقیناً کہیں زیادہ قابل وقعت ہی جس کے بارے میں ایک دوسرے انگریز افسر نے ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیے جانے کی رائے دی ہی۔

صاحبو! میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ جو کتابیں اِس درجہ حقارت سے دیکھی گئی ہیں وہ محض افسانے ہیں، لیکن تاریخ بھی بسا اوقات غلط ہوتی ہی اور اُس کی غلطیاں زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ”بائرن“ اپنی نظم ”لارا“ میں لکھتا ہی۔

”..... تاریخ کا قلم اُس کی بُرائی یا بھلائی کو پورا کرتا ہی۔ وہ سچ کی طرح جھوٹ بولتا ہی اور اُس کا جھوٹ بہت بڑھا ہوُا ہوتا ہی۔“

انگریزی زبان سے جو کتابیں ہندوستانی میں ترجمہ ہوئیں اُن میں ذیل کی کتابیں قابلِ ذکر ہیں:۔ ریورنڈ جے اے شرمن کی ”تاریخ متقدمین و متاخرین“ گولڈ اسمتھ کی تاریخ روم اور تاریخ یونان یا زمانۂ قدیم کے فلسفیوں مثلاً اسکندر، ڈی ماس تھنیز، سسرو وغیرہ کے سوانح زندگی جو پلوٹارک کے انگریزی ترجمے سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ ایک کتاب جس کا نام ”بحری و بری اِنکشافات“ ہی، مارش من کی تاریخ ”انگریزوں کا تسلطِ بنگال“، سلطنت چین کی تاریخ جس کو جے۔ ایف کارکورن نے، جو ایک اینگلو انڈین اور پرجوش کیتھولک تھا، جسوئٹ مشنریوں کی یک طرفہ معلومات سے مرتب کیا تھا۔

مشرقی علم و فضل نیز ہندوستانیوں کی دلچسپی کے نقطۂ نظر سے (جن کے لیے یہ کتابیں شائع کی گئی ہیں)، یہ بات بہت ہی قابلِ افسوس ہے کہ جن کتابوں کا انگریزی سے ترجمہ ہوا وہ تاریخ، سیاست، اور مشرقی ممالک کے مذہب جیسے مضامین پر مشتمل ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کتاب کا ایڈن برا کیبنٹ لائبریری سے ترجمہ ہوا ہے اور وہ شاہانِ مغلیہ کی تاریخ ہے، یا مثلاً ہندوستان کا جغرافیا "مرے" کی "اِن سائیکلو پیڈیا آف جیاگرفی" سے ترجمہ کیا گیا ہے، یا تاریخ فارس جو "ماڈرن ٹریولر" کا ترجمہ ہے اور اِسی قسم کی اور کتابیں ہیں۔ اِس قسم کی کارروائی کے معنی حقیقتاً ہندوستان کو وحشی ملک سمجھنا ہے۔ کیونکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہندوستانیوں کی بہ نسبت اُن کے ملک کو زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ اگر ہندوستان میں تحریری چیزیں نہ بھی ہوتیں تو اُس صورت میں بھی ہم اِسے صحیح تسلیم نہ کرتے۔ اِس کے علاوہ یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ ہم کو جو کچھ بھی معلومات مشرق کے بارے میں ہے وہ مشرقی ہی اہلِ قلم کی بدولت ہے۔

بعض اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ اصل کا مطلب غلط سمجھا گیا ہے۔ نیز اَعلام میں بھی بہت کچھ گڈمڈ ہوگئی ہے۔ اگر اِن خامیوں کے ساتھ اُن خامیوں کو بھی پیشِ نظر رکھیے جو ترجمے کے ساتھ لازمی ہیں تو ترجمے کا ماحصل حقیقتاً ایک بہت ہی نامکمل کتاب ہوگی جس سے ملک کے باشندوں کو اپنے وطن کی تاریخ کے متعلق غلط معلومات پیدا ہوں گے۔ اگر ہندوستانی زبان میں تاریخی کتابیں نہیں ہیں تو بھی کوئی وجہ نہیں کہ انگریزی کو فارسی پر ترجیح دی جائے، کیوں نہ فارسی تاریخوں کا ترجمہ کیا جائے، یا کم سے کم فارسی تاریخوں پر اُن کی بنیاد قائم کی جائے اور جو باتیں اُس میں صراحت کے ساتھ غلط ثابت ہوں یا خلافِ اخلاق تصور

کی جائیں وہ حذف کردی جائیں۔ اِس قسم کا ترجمہ آسان بھی ہوگا اور دیسی اہل قلم اصحاب کی طبیعت کے موافق بھی۔ اِس طریقے سے اُن کے خیالات اپنے ہی ماخذوں پر مبنی ہوں گے اور ترجمے میں جو فاش غلطیاں ہوتی ہیں اُس سے محفوظ رہیں گے، ورنہ ہوتا یہ ہے کہ مفہوم پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے مکھی پہ مکھی مار دیتے ہیں اور ہندوستانی الفاظ کا غلط استعمال کیا جاتا ہے، خاص کر اُن مترجموں کے ہاتھوں ایسے یورپی خیالات اور تلمیحات کی بڑی مٹی خراب ہوتی ہے جن سے وہ بالکل نابلد ہیں۔

مثلاً آنریبل مسٹر ولیم میور نے، جو صوبۂ مغربی و شمالی کی انگریزی حکومت کے سکریٹری ہیں، ٹیلر کی "ہسٹری آف محمڈن اِزم" کے ترجمے کو جسے دہلی کالج کے چار معلّموں نے کیا ہے، بڑے غور سے ملاحظہ فرمایا، وہ بھی میری طرح انہیں نقائص کے شاکی ہیں۔ اِس تاریخ کے پہلے ہی باب میں اُن کو ایسے جملے ملے جو بالکل مبہم ہیں اور جن کا کوئی مطلب نہیں اور جو یقیناً غلط ہیں۔ اِن میں سے اکثر کے متعلق اُنھوں نے اپنے نسخے کے حاشیے پر اشارہ کردیا ہے۔ اِس لائق عہدہ دار کا بیان ہے کہ

> "یہ اور بھی زیادہ قابل افسوس اس وجہ سے ہے کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے ادب میں اچھی استعداد رکھتے ہیں اِن غلطیوں کو فوراً معلوم کرلیں گے اور اس سے ہماری تمام تصانیف اور ترجموں پر بڑا حرف آئے گا"۔

ایک بات اور بھی ہے کہ یہ ترجمے کا کام محض مسلمانوں ہی کے سپرد نہیں کیا گیا بلکہ چار میں سے صرف دو مترجم مسلمان تھے اور باقی دو ہندو۔ جن حصوں کا ترجمہ مسلمان پروفیسروں نے کیا ہے وہ خاصے صحیح ہیں، لیکن

یہ حالت اُس حصے کی نہیں جسے ہندوؤں نے ترجمہ کیا ہے؛ اِس میں عربی الفاظ کا اِملا تک غلط ہے۔ اِس کے علاوہ اِن ابواب میں ہندو مترجموں نے یورپی مصنف کے اُس طرزِ تحریر کو جو اُس نے قرآن اور اِسلام کے متعلق اِستعمال کی ہے، نرم کرنے کی کوشش نہیں کی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جو مسلمان اِسے پڑھے گا وہ برہم ہوگا، حالانکہ پیغمبر (صلعم) اور مکے کے ساتھ معمولاً تعظیمی الفاظ ہمیشہ اِستعمال کیے گئے ہیں، لیکن اُن کا کتاب کے متن سے جوڑ نہیں بیٹھتا۔

صاحبو! میں اِس سے غافل نہیں کہ اِس قسم کے مطبوعات کی سرپرستی سے حکومت برطانیہ کا مقصد محض یورپین خیالات کی اشاعت نہیں بلکہ اُس کے ساتھ مسیحی خیالات کی اِشاعت بھی ہے۔ آخری مقصد نہایت قابلِ قدر ہے اور اُس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، مگر میرے خیال میں یہ مقصد دوسری طرح بھی حاصل ہو سکتا ہے یعنی، جیسا میں نے ابھی کہا ہے، مشرقی کتابوں کی اِصلاح سے۔ فلسفے اور مسیحی اخلاق کی کتابوں کے ترجمے میں کوئی ہرج نہیں، بلکہ اِس قسم کا ترجمہ درحقیقت ہندوستان والوں کے لیے مفید اور کارآمد ہوگا۔ اِسی وجہ سے میں "رابن سن کروسو" Robinson Crusoe کے ترجمے کو اور خاص کر "خدا کے وجود پر فینیلون کے خیالات (Thoughts of Fenelon on the Existence of God)" جس کا ترجمہ "ای۔ راونشا" (E. Rawenshaw) کی انگریزی کتاب سے ہندوستانی میں بہت لیاقت کے ساتھ کیا گیا ہے، بہت پسند کرتا ہوں۔ درصورتِ اِمکان میں یورپ کے بہترین ادبی کارناموں کے ترجمے کا بھی بڑا مویّد ہوں۔ چنانچہ مجھے اِس بات کے معلوم ہونے سے بڑی خوشی ہوئی کہ بنارس کے "سُدھاکر" اخبار میں شکسپیر کے "مڈسمر نائٹس ڈریم" کا ہندی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ "مرچنٹ آف وینس" کے بنگالی ترجمے سے، جو خفیف ترمیمات کے بعد

بالکل مشرقی بنا لیا گیا ہی، بہت اچھا ہی۔ اِس میں شبہہ نہیں کہ بہت جلد ہندوستانی میں اِس نامور انگریز ڈراما نویس کی بہترین کتابوں کا ترجمہ ہوجائے گا اور کیا تعجب ہی کہ اِس وقت دہلی اور آگرے کے تھیٹروں میں بہ مقابلۂ پیرس کے زیادہ کامیابی کے ساتھ "میکبتھ" کا قابل قدر المیہ کھیلا جا رہا ہو، اور ہندوستانی اپنی ہی زبان میں اُن پاکیزہ اشعار کی داد دے رہے ہوں جو اِس نامور شاعر نے ڈنکن کے قتل کے بعد "میکبتھ" کی زبان سے ادا کیے ہیں :-

"میں سمجھا کہ کسی نے آواز دی کہ "بس، اب سونا ختم کرو"!
میکبتھ نے نیند کو، معصوم نیند کو قتل کر ڈالا،
وہ نیند جو افکارِ اِنسانی کی گرہوں کو سُلجھاتی ہی، جو روزمرہ کی زندگی کی موت ہی، اور تھکاوٹ کے لیے بمنزلہ غسل، جو زخمی دماغ کے لیے اکسیر مرہم اور فطرت کا بہترین علاج ہی، زندگی کی ضیافت کی لذتیں اُسی کی رہینِ منت ہیں"۔
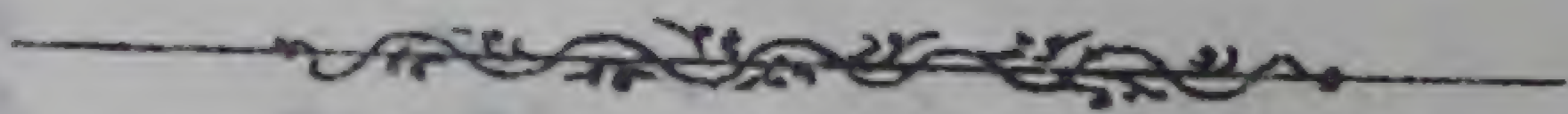
خطباتِ گارساں دتاسی

ادبی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں

مکمّل کتاب کا حجم ۸۴۲ صفحے ہیں۔ قیمت مجلّد صہ (پانچ رُپے) بلا جلد للعہ (چار رُپے آٹھ آنے)

انجمن ترقّیِ اُردو (ہند)، دہلی

K UNIVERSITY LIB.
Acc No 109396
Date 26.2.76
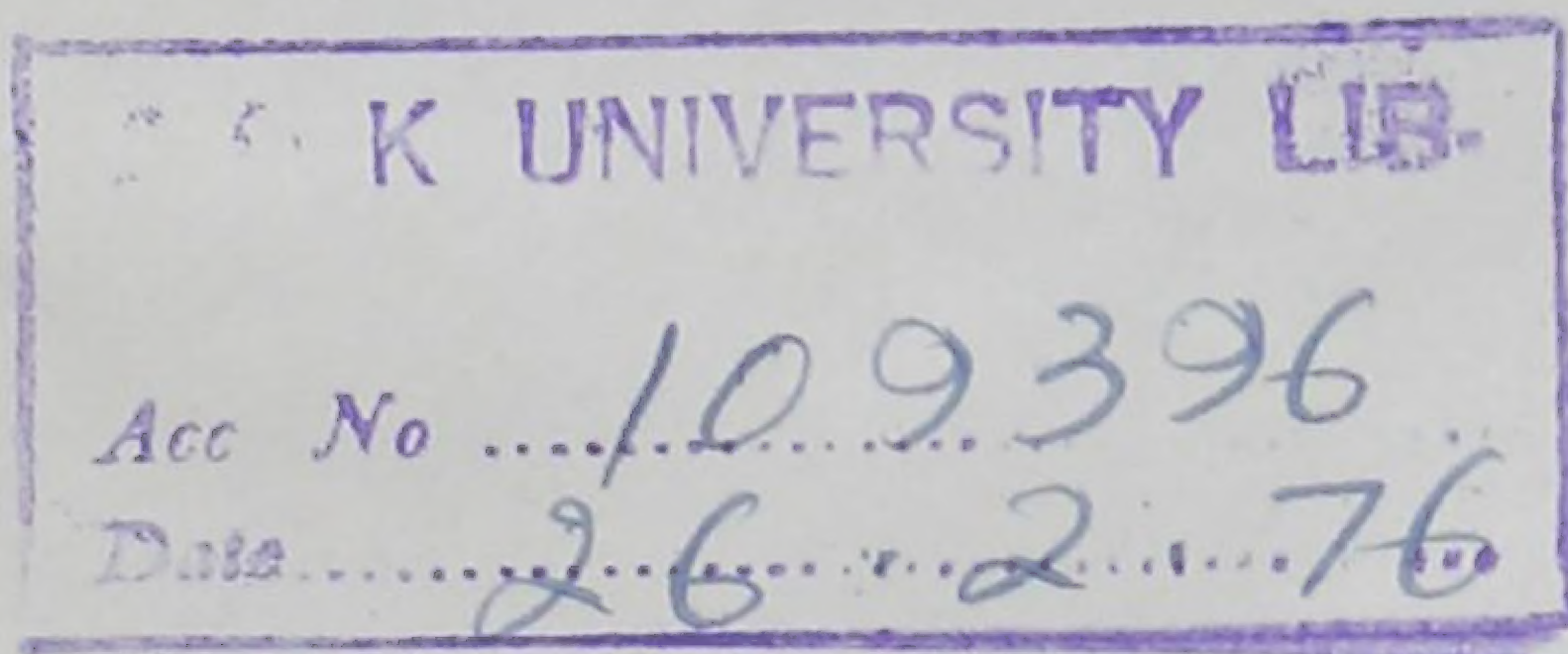
ALLAMA IQBAL LIBRARY